کراچی

آنکھ مچولی

ماہ اکتوبر

قائدِ ملت کا ماہِ شہادت

IMPORTED

QUICE

QUICE Lemon Lime

2 GREAT CANS

2 EXCITINGWAYS TO COOL DOWN & FRESHEN UP !

Quice Food Industries Ltd.
11/139, Jamaluddin Afghani Road, Near Bahadurabad
Karachi 75400,Pakistan. **Ph : 4924814 -15 Fax :(021)4947941**

UHU® یوہو کڈز کلب

دنیا کی سب سے اچھی GLUE بنانے والی مشہور زمانہ جرمن کمپنی UHU® (یوہو) نے قارئین آنکھ مچولی کے لئے پُرکشش CASH انعامات کا اعلان کیا ہے۔ درجِ ذیل سوالات کے درست جوابات ارسال کریں اور CASH انعامات حاصل کریں۔

پہلا انعام	2 ہزار روپے نقد
دوسرا انعام	1 ہزار روپے نقد
تیسرا انعام	500 روپے نقد

ہر درست حل پر ایک UHU® کی T. SHIRT

مقابلہ نمبر 4

1 رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کس عمر میں ملی ؟

2 کن دو پاکستانی بالروں نے ون ڈے کرکٹ میں ۳۰۰ سے زائد وکٹیں لیں؟

3 ریڈیو کس نے ایجاد کیا ؟

4 انار کیوں نہ چکھا، وزیر کیوں نہ رکھا ؟ ان دونوں پہیلیوں کا جواب ایک ہی ہے ذرا جلدی سے بتایئے !!

5 ع تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اس شعر کا پہلا مصرعہ تحریر کریں۔

شرائط

1: جوابات کے ساتھ ایک عدد UHU stic پر لپٹا ہوا پلاسٹک ریپر ضرور بھیجیں۔ 2: ایک سے زائد حل کی صورت میں ہر حل کے ساتھ UHU ریپر بھیجنا لازمی ہے۔ 3: انعامات کا فیصلہ ایک سے زائد درست جوابات کی صورت میں قرعہ اندازی کے ذریعہ کیا جائے گا۔ 4: انعامات کا اعلان حتمی اور ناقابل چیلنج ہوگا۔ 5: تمام حل 10 نومبر تک لازمی آنکھ مچولی کے پتے پر ارسال کریں۔ 6: خوش نصیب انعام یافتگان کا اعلان دسمبر کے شمارے میں کیا جائے گا۔

Don't Say GLUE — Say UHU®

☆ مقابلہ نمبر ۲ کے نتائج صفحہ نمبر ۹۰ پر ملاحظہ کریں۔

Adarts-HMPT-22/95

انوکھے خیال اچھوتی مثال

آنکھ مچولی کراچی

اکتوبر

ماہ شہادت، لیاقت علی خان

نگرانِ اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

تحقیق و تصنیف
محمد سلیم مغل
محمد جاوید خالد

امورِ انتظامی
تحمل حسین چشتی
طارق فوزی

مشاورت
ڈاکٹر طاہر مسعود

امورِ تجارت
شاہد محمود

امورِ تشہیر
عمران احمد

شعبۂ تزئین
محمد سلیم اختر (خطاطی)
مومن رحیم (اسکیچز)
دانش اختر (پینٹنگ)

ولبر رائیٹ اور اورول رائیٹ

دو امریکی بھائی جنہوں نے دسمبر ۱۹۰۳ء میں پہلی کامیاب پرواز کے ذریعے انسانوں کو آسمانوں کی جانب جست لگانے کے قابل بنایا۔ ان بھائیوں کا یہ کارنامہ رہتی دُنیا تک یاد رکھا جائے گا۔

واضح رہے

۱

اس کتاب میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ (گرین گائیڈ اکیڈمی) محفوظ ہیں۔ بغیر اجازت کوئی بھی تحریر یا تصویر شائع نہیں کی جاسکتی۔

۲

اس کتاب میں شائع ہونے والی اسلامی اور تاریخی تحریروں (بشمول قرآن و حدیث) کے سوا جملہ کہانیوں کے کردار فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

۳

اس کتاب کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں کی نشوونما اور کردار سازی کے لیے شائع کیا۔

۴

آنکھ مچولی کا یہ کتابی سلسلہ وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہتا ہے۔

قیمت – ۱۸ روپے – ۷ درہم – ۷ ریال

زرِ سالانہ

۲۸۰ روپے (مع ڈاک خرچ) پاکستان
۱۰۰ ریال (مع ڈاک خرچ) مشرقِ وسطیٰ
۱۰۰ درہم (مع ڈاک خرچ)

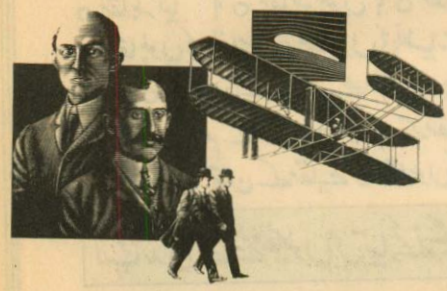

ناشر: ظفر محمود شیخ
طابع: زاہد علی
مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ کراچی
فون نمبر: 4942857-4948210

خط و کتابت کا پتہ

آنکھ مچولی
گرین گائیڈ اکیڈمی، اے پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

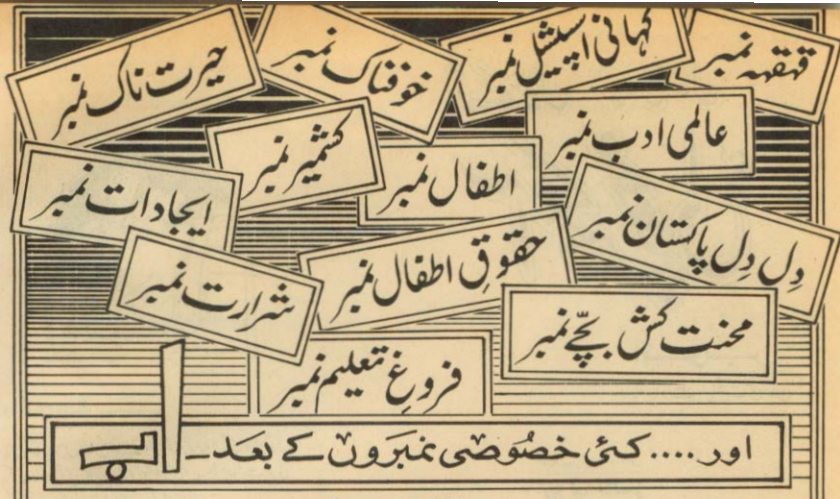

مقابلوں اور انعامات کے انبار لیے

آنکھ مچولی کا مقابلہ نمبر

جنوری ۱۹۹۷ء میں شائع ہو رہا ہے

ہم آپ کو دعوتِ تحریر دیتے ہیں

○ مقابلہ کیا ؟ ○ مقابلہ کیوں ؟ ○ مقابلہ کیسے ؟ ○ مقابلے کی تاریخ ؟
○ مقابلوں کی اقسام ؟ ○ مقابلوں کی نفسیات ○ مقابلوں کے مقابلے ○ تاریخی مقابلے ○ مزاحیہ مقابلے ○ انوکھے مقابلے ○ عجیب و غریب مقابلے ○ ذہانت کے مقابلے ○ علم کے مقابلے ○ کھیلوں کے مقابلے ○ مقابلوں کے کھیل ○ مقابلے کے امتحان ○ امتحان کے مقابلے ○ مقابلوں کی کہانیاں ○ مقابلوں کی نظمیں ؛

آپ کو زندگی کے بڑے مقابلوں میں تیار کرنے کے لیے آنکھ مچولی بہت جلد آ رہا ہے

مقابلے کے موضوع پر دلچسپ تحریروں سے سج دھج کر ؛

۸	سنہرے حروف	ادارہ
۹	پہلی بات	ڈاکٹر طاہر مسعود
۱۰	نعت	حلیمہ سعدیہ
۱۱	دو پرچم ایک انسان	شمس نوید عثمانی
۱۸	اِک دوجے سے پیار کرو (نظم)	قتیل شفائی
۲۱	شیر کی خالہ اور خالو	نعمان احمد خان
۲۳	سنہرا خون	غلام حسین میمن
۲۸	بول میری مچھلی (نظم)	پروفیسر عنایت علی خان
۳۰	بہادر لڑکا	ترجمہ: احفاظ الرحمٰن
۳۵	چولہے کس طرح ایجاد ہوئے	فرزانہ واحد بخش
۳۹	پانچ ہزار سال پرانی لاش	محمد خالد
۴۰	پیٹو (نظم)	ضیاء الحسن ضیاء
۴۱	سوری	محمد جاوید خالد
۴۸	پہلی بار	محمد صابر
۵۲	کیسے کیسے حالات	ارشد نواز، کوہاٹ
۵۴	آسمانی بجلیاں	خالد آذر
۵۷	غصّے پر غصّہ	فاروق حسن چانڈیو
۶۴	کچھ سانپوں کے بارے میں	نگہت آراء چوہان
۶۷	بھالو (نظم)	محسن علی
۶۸	پانی کا سفر	سیّد مسعود الحسن رضوی ادیب
۷۰	ایک سوال، دس جواب	مرسلہ: محمد شعیب طاہر
۷۵	قصّہ کوئز-۲	سلیم مغل
۷۸	نامے میرے نام	قارئین کے خطوط پر مبنی
۸۲	سوا سیر	الطاف حسین
۹۱	سُست لڑکا	عبدالباسط
۹۵	لطیفے شطیفے	منتخب لطائف
۹۹	ہالینڈ اولمپک چیمپئن	واجد رضا اصفہانی
۱۰۳	آنکھوں سے آنکھ مچولی تک	عقیلہ رشید
۱۰۷	بیس ہزار ڈالر کی خاطر	احسان الٰہی
۱۱۰	میرے کھلونے (نظم)	مرسلہ: انیس احمد
۱۱۲	جدّہ	ابوغازی محمد
۱۲۰	تیزابی بارش	یاسر اعجاز
۱۲۳	سیلاب	حامد علی شاہد
۱۳۰	اقرأ	خالد بن محمود احمد

سنہرے حروف

ایک دہریہ، ہارون الرشید کے دربار میں آیا اور کہنے لگا کہ "اپنی سلطنت کے سب سے بڑے عالم کو بلا دیجیے، میں وجود باری تعالیٰ پر مناظرہ کروں گا اور قائل کروں گا کہ خدا کا کوئی وجود نہیں۔" خلیفہ ہارون الرشید نے امامِ اعظمؒ کو بلا بھیجا۔ امام صاحب نے فوراً آنے کا وعدہ کیا، لیکن دربار میں تاخیر سے پہنچے۔ دہریے کو موقع ہاتھ آگیا اور اس نے شور مچایا کہ اتنے بڑے عالمِ دین نے وعدہ خلافی کی ہے اور وقت کی پابندی کا خیال نہیں رکھا۔ ہارون الرشید کے دریافت کرنے پر اِمام صاحب نے جواب دیا۔ "میرا گھر دریا کے کنارے پر ہے یہاں آنے کے لئے مجھے دریا عبور کرنا تھا مگر گھاٹ پر کوئی کشتی نہ تھی میں سوچ کے عالَم میں کھڑا تھا کہ کنارے پر سے ایک درخت ٹوٹ کر گرا خود بخود اس کے تختے بن گئے اور ان تختوں سے فوراً ہی ایک کشتی تیار ہوگئی اور اس کشتی نے مجھے دوسرے کِنارے پر پہنچا دیا۔"

یہ سن کر دہریہ چلاّ اُٹھا۔ بالکل بکواس ہے یہ سب بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ کشتی بنانے والا نہ ہو اور کشتی خود بخود ہی تیار ہو جائے۔" امامِ اعظم نے جواب میں فرمایا۔ "جب ایک چھوٹی سی کشتی خود بخود تیار نہیں ہو سکتی تو پھر یہ اتنی بڑی اور حیرت انگیز کائنات بغیر کسی خالق کے وجود میں کیسے آسکتی ہے؟"

یہ جواب سن کر دہریہ دم بخود رہ گیا۔

پہلی بات

طاہر مسعود

انسان کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں۔ اتنی نعمتیں کہ جنہیں گنا بھی نہیں جا سکتا۔ ہر نعمت دوسری نعمت سے بڑھ کر ہے۔ انسان خود اپنے وجود پر غور کرے تو اس کا اندازہ اسے بآسانی ہو سکتا ہے۔ مثلاً" آنکھیں جن سے وہ دیکھتا ہے' کان جن سے سنتا ہے' ٹانگیں جن سے وہ چلتا ہے اور اسی طرح انسانی جسم کا ہر عضو جو اتنا ضروری ہے کہ اس میں سے کوئی ایک عضو بھی کم ہو جائے تو اس کا خراب اثر آدمی اپنی زندگی پر محسوس کر سکتا ہے۔ نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت تو خود یہ زندگی ہے۔ زندگی جو اللہ تبارک تعالیٰ کا سب سے قیمتی تحفہ ہے۔ اس زندگی کی حفاظت کرنا اور اسے ایک ایسے عمدہ طریقے پر گزارنا جس سے آدمی خود بھی مطمئن اور پرسکون رہے اور جس کا یہ تحفہ ہے' وہ بھی راضی رہے' اصل میں یہی اس زندگی کا مقصد ہے۔

کوئی یہ پوچھ سکتا ہے کہ اس مقصد کو پانے کا طریقہ کیا ہے؟ یعنی ہم کس طرح خود کو اور اپنے اللہ کو خوش اور راضی رکھ سکتے ہیں؟ اس کا ایک لفظ میں آسان سا جواب ہوگا : "اطاعت" یہ لفظ بہت چھوٹا سا ہے۔ لیکن زندگی کا سارا سکون' ساری مسرت اسی ایک لفظ میں پوشیدہ ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ آدمی کو زندگی میں دو چیزوں میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ آدمی اطاعت کرے یا بغاوت۔ اطاعت اللہ کی' اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی' والدین کی' اور ان سب اصولوں اور قوانین کی جس میں خود آدمی کی بہتری پوشیدہ ہے۔ اچھے لوگ وہی ہوتے ہیں جو اطاعت کرتے ہیں۔ آج کا زمانہ بغاوت کا زمانہ ہے۔ بغاوت اگر برائی اور ظلم کے خلاف ہو تو اچھی بات ہے۔ لیکن بغاوت اگر اچھی باتوں کے خلاف ہو تو اس سے زیادہ بری چیز کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ اطاعت ایک مثبت چیز ہے۔ اطاعت کرنے کے لئے آدمی کو اپنی طبعیت پر قابو پانا پڑتا ہے۔ اس لئے یہ کام مشکل محسوس ہوتا ہے لیکن جو لوگ اپنی طبعیت کو مار کر خود کو اطاعت کا عادی بنا لیتے ہیں' وہ ہر جگہ سُرخرو رہتے ہیں' اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اور دنیا میں بھی۔ اس لئے آپ کو چاہئے کہ خود کو ایک اطاعت گزار بندہ' اطاعت گزار اولاد' اطاعت گزار طالب علم اور اطاعت گزار شہری بنائیں کہ اسی میں سکون اور اسی میں نجات ہے۔

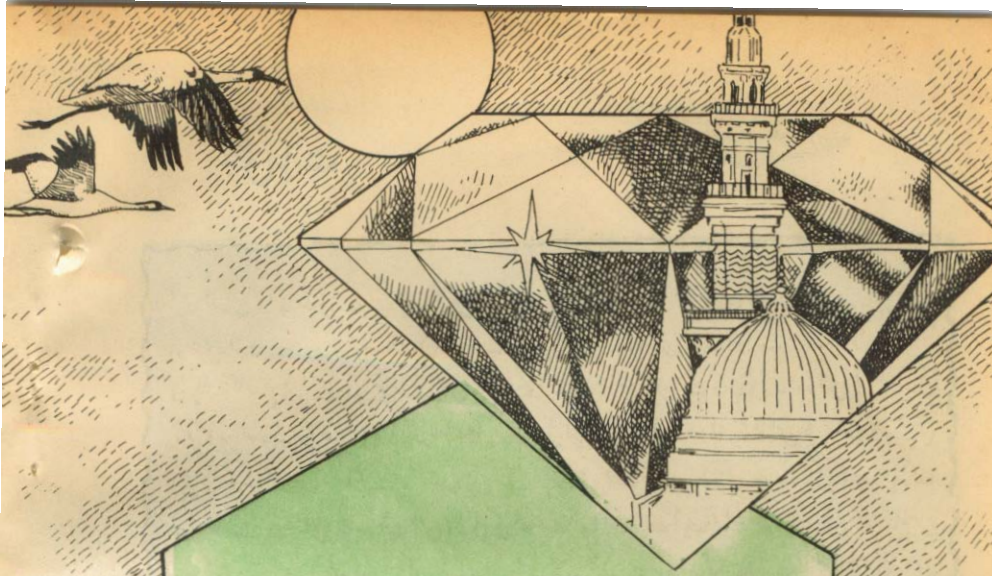

نعت رسول مقبول ﷺ

حلیمہ سعدیہ

عشق رسول پاکؐ نے کیا کیا عطا کیا
میں نے غمِ جہان کو دل سے بھلا دیا
مجھ کو بھی رشک اپنے مقدر پہ ہے بہت
مجھ بے نوا کو آپؐ نے در پر بلا لیا
دنیا کی الجھنوں سے میں آزاد ہوگئی
ذکرِ رسول پاکؐ وظیفہ بنا لیا
اب آرزوئیں اپنا ٹھکانہ کہیں کریں
میں نے تو اپنے دل میں مدینہ بسالیا

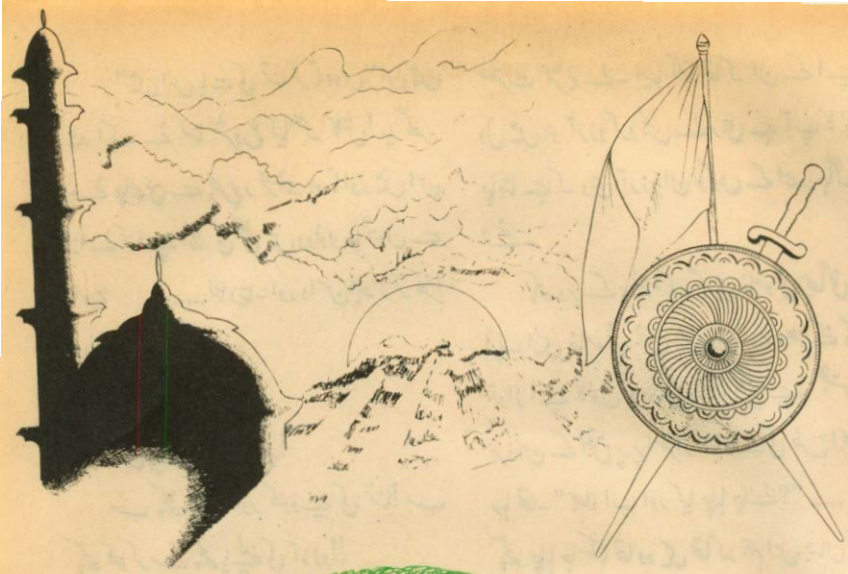

دو پرچم ایک انسان

شمس نوید عثمانی

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس امت کے چند قیمتی دل و دماغ بیٹھے تھے۔

حضرت عمرؓ کا جی چاہا کہ ہم ایک دوسرے کے دل میں جھانک کر ایک دوسرے کے باطن سے بھی ملاقات کیوں نہ کر دیکھیں!

اس کے لئے ان کی مومنانہ فراست کو بڑی اچھی راہ سوجھی۔ حق یہ ہے کہ مومن کی فراست کا جواب نہیں۔ وہ تو خدا کی روشنی میں دیکھتا ہے۔

"تم لوگ کوئی آرزو کرو۔" انہوں نے اہلِ محفل سے کہا اور گویا اس طرح دلوں کے دریچوں پر دستک دے دی۔۔۔۔ "سوچو! اس وقت وہ کیا شے ہے جس کو تمہارا جی چاہتا ہے؟"

شرکائے محفل نے یہ بات سنی اور اس حسین تجویز سے بہت محظوظ ہوئے۔ اچھے لوگوں کی تفریح بھی کیسی اچھی ہوتی ہے۔

"میں اس بات کی تمنا کرتا ہوں" ان میں سے ایک نے کہنا شروع کیا "کہ کاش! یہ گھر سونے چاندی سے بھرپور خزانہ ہوتا اور میں اس خزانے کو اپنے اللہ کی گلی میں دونوں ہاتھوں سے لٹا دیتا ..... لٹا دیتا۔ اور دامن جھاڑ کر کھڑا ہو جاتا۔"

یہ تمنا.....!

کیسی پیاری تمنا تھی یہ!

سب کچھ پانے اور کھو دینے کی تمنا! سب کچھ کھو کر سب کچھ پالینے کی آرزو!!

اس اظہار تمنا نے حاضرین کے جذبات کی ایک بہت اچھی بنیاد رکھ دی چنانچہ سب کے جذبات اسی سمت میں بہہ نکلے۔ دوسری آواز جو اس کے بعد سنی گئی وہ بھی گویا پہلی آواز کی بازگشت ہی تھی۔

"اے کاش! کسی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "اے کاش! یہ مکان ہیرے جواہرات سے بھرپور ہوتا! اور میں یہ ساری دولتِ دنیا اللہ کے قدموں میں ڈال کر پکار اٹھتا کہ" میرے مالک! مجھے صرف تو اور تیری رضا چاہئے!"

"اچھا، کوئی اور تمنا کرو!" مومنانہ سینوں کی اس پرشوق موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے حضرت عمرؓ بولے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کے اپنے دل میں جو آرزو کروٹیں لے رہی ہے آپ کا جی چاہتا ہے کہ وہی آرزو ان لوگوں کے اندر جاگ اٹھے۔

کچھ دیر کے لئے ایک گہری خاموشی چھا گئی۔ ایک ایسی خاموشی جس میں دل کے دھڑکنے کی آواز اپنے کانوں کو سنائی دینے لگتی ہے۔ تجسس ہر ذہن کے افق پر پراسرار ستارے کی طرح ابھر رہا تھا۔ "بھلا اب اور کیا چاہا جائے؟" ..... جو کچھ چاہا جا سکتا تھا وہ یہی تھا کہ ہم اس جہاں کی سب سے قیمتی پونجی پائیں اور پھر اس کو "زمین و آسمان کے نور" اللہ رب العالمین کے لئے ہنسی خوشی لٹا دیں۔

اور ..... ظاہر ہے سونا چاندی، زر و جواہر ہی اس دولت کی آخری حسین ترین شکلیں ہیں۔

"ہم نہیں جانتے۔ اے مومنوں کے سردار!" آخر سب لوگوں نے ہار مان لی "کہ آخر اب اور کس چیز کی آرزو کریں.....؟"

ہائے میرے مالک! کیسے تھے وہ لوگ جو یہ نہیں جانتے تھے کہ تیری آرزو کے بعد اب کیا آرزو کی جائے! ..... ہائے وہ سینے جنہوں نے اپنے اندر تیری آرزو کو بسا کر تمام جہانِ آرزو

کے لئے اپنے دل کی کھڑکیاں بند کرلی تھیں!.....
جو دنیا اور اس کی پونجی کی آرزو کرتے ہیں مگر صرف اس لئے کہ اس کے لئے خود بک جانے کے بجائے اس کو بیچ کر جنت خریدی جائے.... خدا کو حاصل کرلیا جائے!

محفل کا جذباتی اشتیاق اپنی آخری انتہاؤں کو چھو رہا تھا۔ لوگ منتظر ہیں' سراپا انتظار ہیں ..... کہ دیکھیں امیرالمومنین کے منہ سے کیا بات سنتے ہیں!

"میں آرزو کرتا ہوں"۔ گہری خاموشی کو تھرتھراتی اور دلوں کو تیز دھڑکاتی ہوئی آخر صدائے فاروقی بلند ہوہی گئی۔ "ہاں لوگو! میں آرزو کرتا ہوں کہ یہ غریب خانہ ابو عبیدہؓ بن الجراح' معاذؓ بن جبل' سالم مولیٰؓ ابی حذیفہ جیسی قیمتی ہستیوں سے معمور ہوتا! ..... اے کاش!" .....اس آرزو پر دھک دھک کرتے ہوئے دل تڑپ کر آنکھوں اور لبوں تک کھنچ آئے۔ آنکھیں نم ہوگئیں اور لبوں پر "اللہ اکبر" کی صدائیں جگمگا اٹھیں۔ اس میں کیا شک تھا کہ امیرالمومنین نے جو آرزو کی تھی' جن لوگوں کی تمنا کا اظہار کیا تھا ان کے تو پاؤں کی دھول بھی کائنات کے سارے خزانوں سے بڑھ کر ہے۔

☆ --- ☆ --- ☆

کوئی شخص ہمہ تن جذب و شوق بنا ہوا اللہ کی آخری کتاب پڑھ رہا تھا۔ ہاں یہ خود اللہ کے الفاظ تھے جس کو دیکھنے کے لئے ہر مومن کی آنکھیں عمر بھر ترستی ہیں۔

ہاں' یہ انسان کی آواز تھی ..... ایک ایسے انسان کی آواز جس کو اس کائنات کی فضاؤں نے آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے سنا تھا مگر آج تک جس کے تصور سے پوری کائنات پر وجد طاری ہے۔ ایک آواز جو ہونٹوں کی جنبش کی بجائے دل کی لرزشوں سے پیدا ہو رہی تھی۔

خدا کے الفاظ اور آدمی کی آوازِ دل ملنے سے نہ جانے کیا شے پیدا ہوئی تھی کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ اس کو سن کر چلتے چلتے رک گئیں۔ کھڑی کی کھڑی رہ گئیں! ..... ہاں! ان کے قدم بھی اس آواز نے روک لئے تھے! ..... آپ اس وقت سراپا گوش ہو کر رہ گئیں اور اس تلاوت میں ڈوب سی گئیں کہ جس میں خدا کے الفاظ اور آدمی کی بے قرار آواز نے مل کر جذبات کی دنیا میں زبردست ہلچل برپا کردی تھی۔

حضرت عائشہؓ آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچیں تو سرور کائناتؐ نے ان کے رک جانے کی وجہ معلوم کی۔

"خدا کا کوئی بندہ قرآن پڑھ رہا تھا!" حضرت عائشہؓ کی آواز میں درد تھا "اور ایسا پڑھ رہا تھا کہ بس کیا بتاؤں! میں اسی کو سنتی رہ گئی۔"

یکایک حضورؐ اپنی جگہ سے بے تابانہ اٹھے!..... چادر سنبھالتے ہوئے کشاں کشاں وہاں پہنچے جہاں وہ آدمی قرآن پڑھ رہا تھا کہ جس کی تلاوت کے ذکر جمیل نے قرآن اور صاحب وحی کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ یا اللہ! وہ کیسا آدمی تھا!

اور ..... وہ آدمی وہی شخص نکلا جس کی آرزو حضرت عمرؓ نے کی تھی۔ ہاں یہ سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہ ہی تھے۔ آنکھ اٹھائی تو دیکھا کہ ایک عجیب والہانہ کیفیت سے وہ ہستی ان کو تک رہی ہے جس کے سینے پر قرآن نازل ہوا تھا۔ آنکھیں چار ہوئیں اور چند لمحے .... ہائے وہ چند لمحے جو دنیا میں بیٹھے بیٹھے جنت میں گزر گئے! خدا جانے قرآنی سوز میں ڈوبا ہوا سالمؓ کا چہرہ..... آنسوؤں اور نور میں ڈوبا ہوا چہرہ حضورؐ کو کیسا نظر آیا کہ آپؐ بے اختیار پکار اٹھے۔

"کیا ہی خوب ہے وہ خدا جس نے میری امت میں تم جیسے لوگ پیدا کیے!"

یہ تعریف!..... جس میں لفظ گنتی کے اور معنی سمندر کے تھے۔

یہ کتنی بڑی تعریف تھی!..... اتنی بڑی کہ سننے والا اس کو سن کر فرطِ خوشی سے، کمال انکساری سے رو دیا!.....

حالانکہ دیکھئے تو بظاہر حضرت سالمؓ محض قرآن پڑھ رہے تھے۔ وہی قرآن جس کو ہم بھی بار بار پڑھتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن کیا سچ مچ یہ محض قرآن کا پڑھنا ہی تھا؟..... خدا کے لفظوں کو محض زبان سے دہرانا ہی تھا!..... یا قرآن پڑ ..... اللہ تعالیٰ کی گفتگو پر سر دھنتے دھنتے ایک مومن کی زندگی قرآن ہی میں ڈھل کر رہ گئی تھی؟.....

دل کی دھڑکنیں اور روح کی بے تابیاں جو کبھی اس طرح قرآن پڑھتی تھیں اب وہ کہاں! وہ تو نفس اور شیطان کبھی کے لوٹ لے گئے۔ ہاں قرآن رہ گیا اور..... قاری خدا کے پاس چلے گئے۔

☆ --- ☆ --- ☆

جنگ یمامہ میں.....

یہی سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہ عملی طور پر یہ راز سمجھا رہے تھے کہ جس سینے میں قرآن اتر آئے تو اس کی زندگی کا عالم کیا ہوتا ہے! یہی تھا وہ میدانِ کار زار جہاں مسلمانوں کو ان مرتدوں سے نبرد آزما ہونا تھا جنہوں نے اللہ کو ایک بار پا کر کھو دیا

تھا۔ جو شیطان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اللہ والوں کی غیرت کو للکار رہے تھے۔ ہاں یہ جنگ انسان کی غیرت، بندگی اور شیطانی بے حمیتی کے درمیان ایک نازک اور فیصلہ کن ٹکراؤ تھی اور اسی معرکۂ جسم و جاں میں اسلامی پرچم حضرت سالمؓ کے ہاتھ میں تھا۔ جو قرآن کا علمبردار تھا وہی آج اسلام کا بھی علم بردار تھا۔ گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔

اسلام کا پرچم سرنگوں کرنے کے لئے خدا کے دشمنوں نے اسلامی علمبردار پر زبردست یورش کر ڈالی تھی۔

"اب یہ جھنڈا کسی اور کو دے دیجئے!" کچھ مسلمانوں کی پکار بلند ہوئی "دیکھئے آپ کی جان خطرے میں ہے۔ جلدی کیجئے....."

"جان!..... کیسی جان!!" غیرتِ قرآن اور حمیتِ ایمانی نے سالمؓ کا چہرہ تمتما کر رکھ دیا..... "پھر تو میں بڑا ہی برا حامل قرآن ہوں گا!"

ایک بجلی سی چمکی اور اب حضرت سالمؓ وہاں تھے جہاں خون آشام تلواریں بجلیوں کا لشکر بن گئی تھیں شاید انہوں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اب اس پرچمِ حق کو دشمن کی صفوں میں باطل کے ٹھیک سر پر لہرائے بغیر دم نہ لیں گے..... شاید انہوں نے اس پرچم پر مرجانے ہی کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اب وہ شیطان کی صفوں کو چیرتے پھاڑتے جارہے تھے..... کہ یکایک ایک غضب ناک تلوار کھڑکی، چمکتی ہوئی ان کے داہنے ہاتھ پر گری اور ہاتھ کٹ گیا۔ مگر پرچم؟ وہ کہاں سرنگوں ہوا!..... وہ تو اب دوسرے ہاتھ میں جوں کا توں اٹھا ہوا تھا! دوسری تلوار گری اور بایاں ہاتھ بھی تراشتی چلی گئی۔

لیکن دونوں ہاتھوں سے محروم ہوجانے والے حضرت سالمؓ کے اطمینان کے لئے یہ بات کافی تھی کہ "اس جھنڈے کو سنبھالنے کے لئے میری گردن تو باقی ہے۔" دونوں شاخوں سے خون کی جگہ غیرتِ ایمانی کا "لہو ترنگ" پھوٹ نکلا۔ اب ان کے پاس دو پرچم ہوگئے تھے ایک پرچم اسلامی جن کو دونوں ہاتھ کٹا ہوا سپاہی اپنی گردن میں ڈالے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا دوسرے قرآن کا پرچم جس کی چند ولولہ انگیز آیتیں اس وقت اچانک ان کے لبوں پر تڑپ رہی تھیں۔

"محمد (صلی علیہ وسلم) ایک رسول ہیں.... اور کتنے ہی نبی ایسے ہوچکے ہیں کہ جن کے ساتھ بہتیرے اللہ والے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔"

یہ جھنڈا!!

خدا کی یکتائی و کبریائی کا جھنڈا.....

محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور آخری رسالت کا جھنڈا.....

ہاں یہ اس وقت سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہ نے چھوڑا جب دم نے ساتھ چھوڑ دیا اور گردن بھی قلم ہوگئی۔

خدا کی قسم! ..... خدا کی قسم!! ..... کتنا خوبصورت رہا ہوگا وہ جسم جس میں نہ اب دست و بازو باقی تھے نہ سر اور گردن! ..... سب خدا کے لئے کٹ چکے تھے ..... سب خدا کے لئے کٹ چکے تھے ..... جان اسی کے لئے نثار ہو چکی تھی جس نے جان عطا کی تھی! ایک دھڑ..... جو اشک بار آنکھوں سے سو بار چومنے کے قابل تھا۔ ایک دھڑ جس کو شیطان نے کاٹا اور فرشتے اٹھا کر خدا کے پاس لے گئے۔

☆ --- ☆ --- ☆

اور ہم!

دونوں ہاتھوں والے اور دو دو بازوؤں والے ہم!! ..... کہ جن کا سر بھی سلامت ہے اور گردن بھی ..... ہائے پھر بھی ہم نے وہ توحید و رسالت کا پرچم جیتے جی سرنگوں کردیا ..... جیتے جی زمین پر گرا دیا ہے۔

اور.....

پھر بھی خود کو "مسلمان" کہتے ہوئے ہمیں شرم نہیں آتی!

دل نہیں دکھتا.....

آنکھ نہیں روتی!.....

کچھ نہیں ہوتا!!.....

ہائے میرے مالک! ..... ہمیں کچھ بھی نہیں ہوتا!..... کچھ بھی نہیں ہوتا.....

●●●

متوازن غذا
صحت کی ضامن

ماہرین غذائیت، غذاؤں کو درج ذیل چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں

- سبزیاں، پھل اور فروٹ
- اناج، چاول، گندم اور دالیں وغیرہ
- دودھ، مکھن، گھی، پنیر اور دہی وغیرہ
- گوشت، انڈے، مرغی اور مچھلی وغیرہ

اگر آپ نے دن بھر کی غذاؤں میں ان چاروں حصوں سے کچھ نہ کچھ چکھ لیا تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے متوازن غذا کھالی اور آپ کے جسم کو مطلوبہ توانائی میسر آگئی۔

اشتہار برائے ترغیب حفظان صحت و تندرستی اطفال - آنکھ مچولی

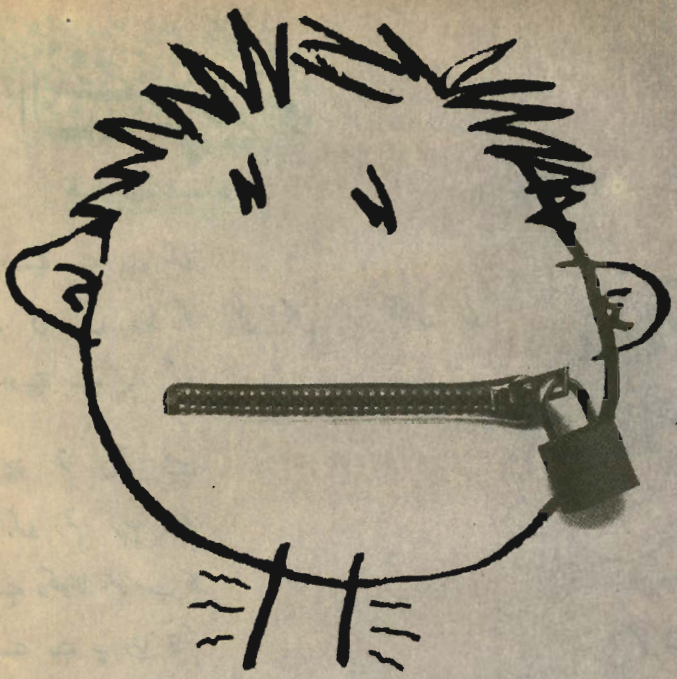

بے مقصد گفتگو سے کہیں بہتر ہے
مُنہ کو بند رکھا جائے

اِک دوجے سے پیار کرو

قتیل شفائی

اک دوجے سے پیار کرو
کانٹوں کی اس دنیا کو مل جل کر گلزار کرو
اک دوجے سے پیار کرو

لفظ چنو تم ریشم جیسے
بات کرو تم نرم ملائم
پیار ہے رکھوالا ہم سب کا
پیار سے ہے یہ دنیا قائم
بیٹھ کے پیار کی نیا میں آگ کا دریا پار کرو
اک دوجے سے پیار کرو

پیار اک ایسا پیڑ ہے بچو
ٹھنڈ جس کا ہر سایا ہے
اس کے سائے میں جو بیٹھا
اس نے ہمیشہ سکھ پایا ہے
تم بھی پیار کے سایوں سے دل کو ٹھنڈا ٹھار کرو
اک دوجے سے پیار کرو

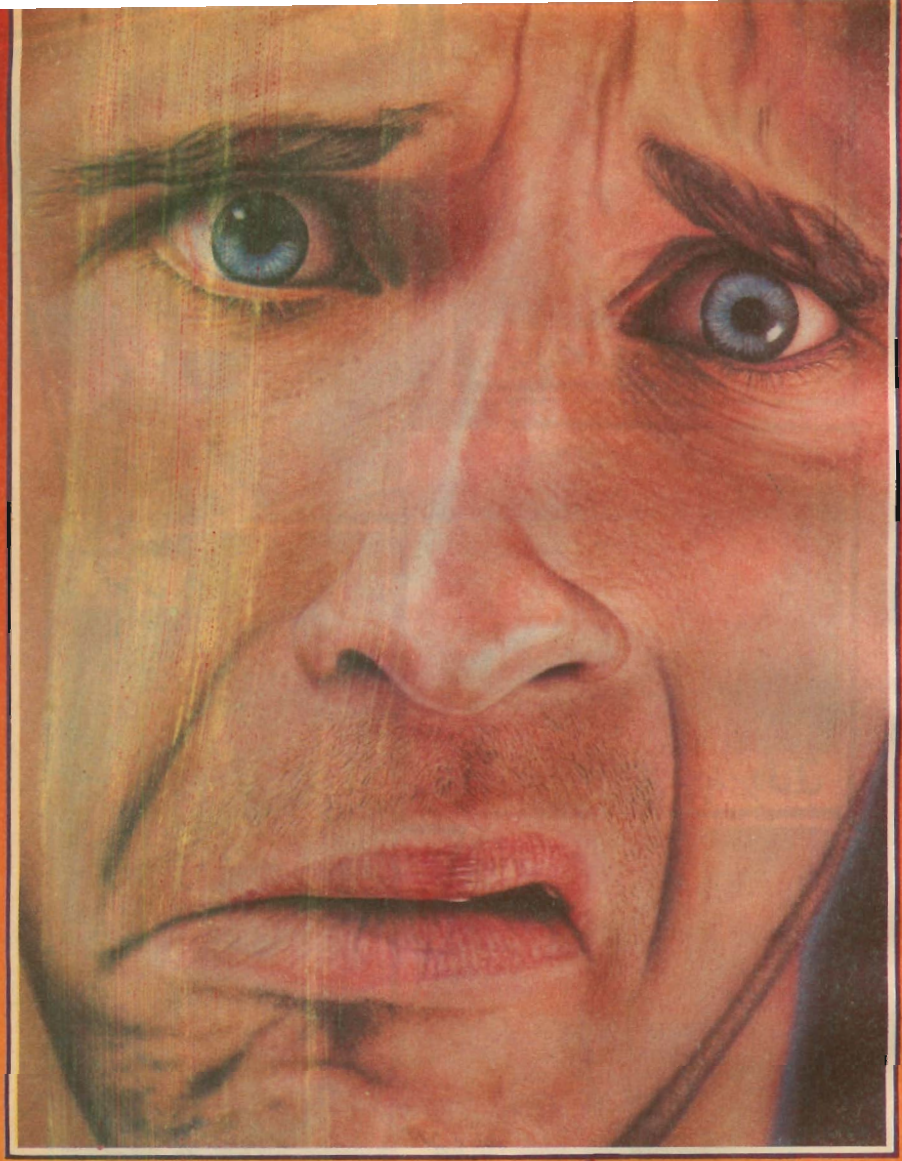

کیپشن لگائیے، انعام پائیے

اس رونی صورت کو بغور دیکھیے اور بتائیے کہ اس بے چارے کی یہ حالت کیوں کر ہوئی۔ اس تصویر پر بہترین جملہ چسپت کیجیے اور 10 قیمتی انعامات جیتیے۔ (اس مقابلے میں شرکت کے لئے کوپن اس شمارے سے حاصل کیجیے)

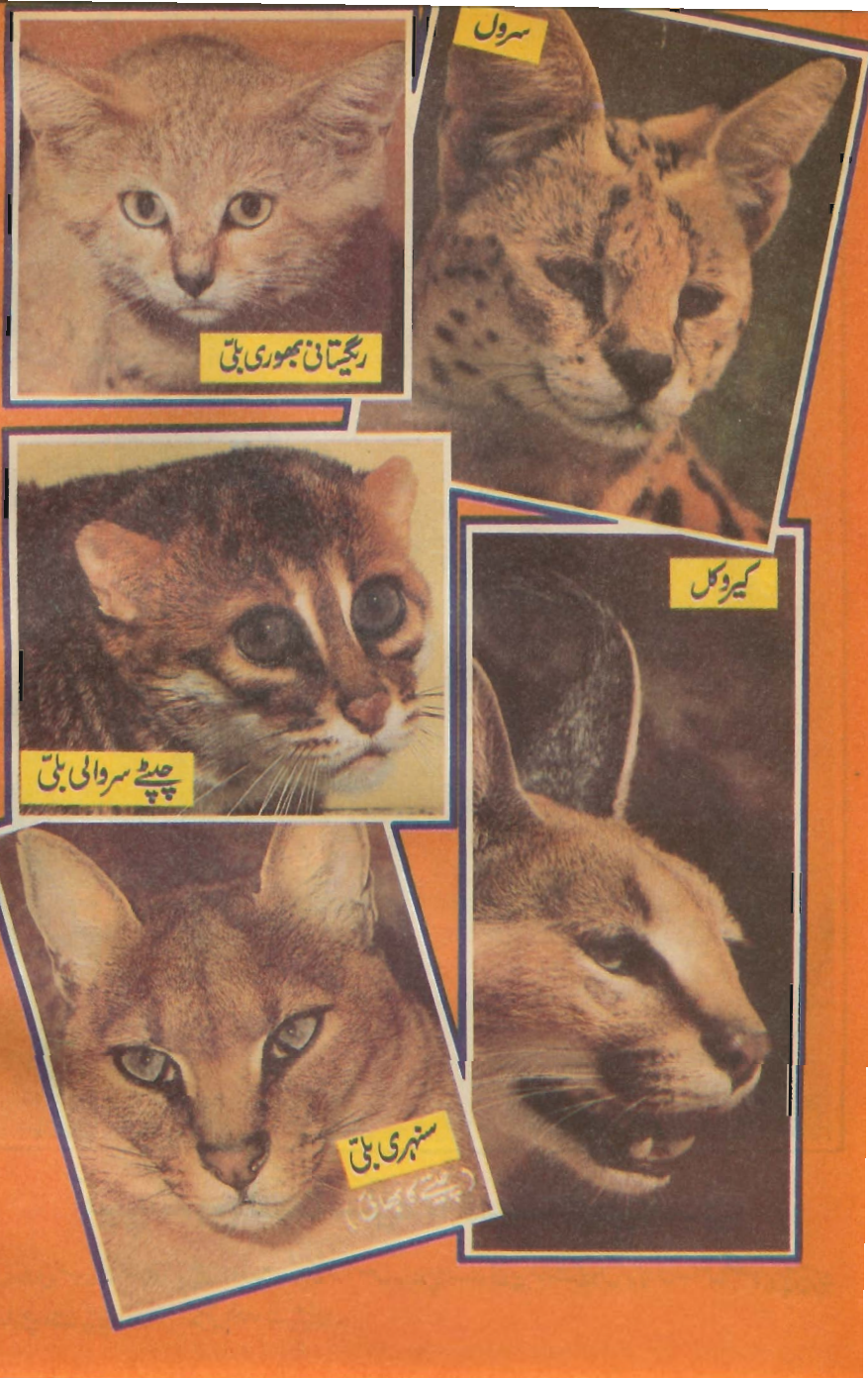
سرول
ریگستانی بھوری بلی
کیرو کل
چپٹے سر والی بلی
سنہری بلی
(چیتے کی بھائی)

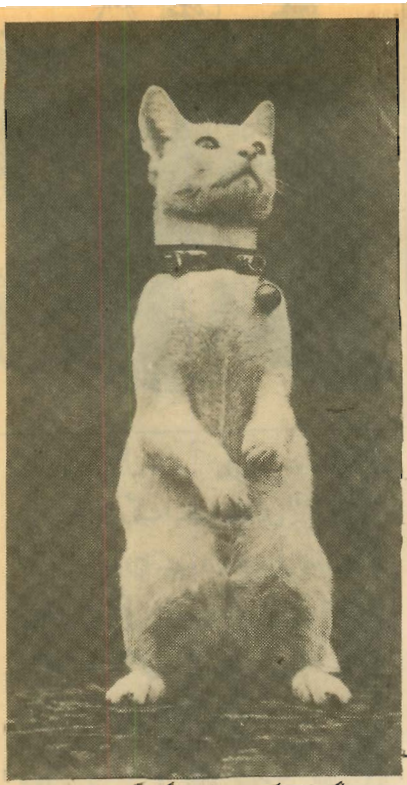

شیر کی خالہ اور خالو

نعمان احمد خان

کیروکل : "خوں خوار" اس کا لقب ہے اور یہ اپنے سائز کی دوسری تمام بلیوں سے تیز تر ہے یعنی رفتار میں کوئی دوسری اس جیسی بلّی نہیں۔ یہ جنوبی روس سے لے کر افریقہ تک کے خُشک علاقوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کو خونخوار کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ شکاری بلّی اگر اکیلے شُتر مُرغ یا چیل کو پالے تو اس پر حملہ کرنے سے گریز نہیں کرتی ہے اس کے پاس احتیاط سے جایئے گا ..... مگر آپ شُتر مُرغ تو نہیں!

سنہری بلّی (چیتے کا بھائی) : اس کو یہ نام اس کے انتہائی نرم وملائم سیاہی مائل گولڈن فر کی بدولت دیا گیا ہے۔ اس کی چمکدار اور خوفناک نِگاہیں بتارہی ہیں کہ یہ خود بھی کتنی خوفناک ہوگی۔ عموماً مغرب کے بعد ہی شکار کو نکلتی ہے اس کا شکار چھوٹے میمل اور پرندے ہیں مگر یہ ایک چھوٹے ہرن کو بھی قتل کردیتی ہے۔ یہ مغربی افریقہ کے گرم بارانی (بارشوں والے) جنگلات میں رہتی ہے۔ انسان اس کا ایک بڑا دشمن ہے۔

مقامی لوگ اس کو "چیتے کا بھائی" کہتے ہیں۔

ریگستانی بھُوری بلّی : درمیانے سائز کی یہ بلّی اپنے مسکن کے لحاظ سے نہایت سخت جان بلّی ہے یہ افریقہ، ایشیا اور عرب کے گرم ترین صحراؤں میں رہتی ہے۔ قدرت نے اس کے جسم میں ایسی کافی تبدیلیاں کی ہیں جو اس کی معاون ہیں۔

مثلاً اس کی ٹانگوں پر لمبے اور گھنے فر ہیں جو گرم ریت پر بیٹھنے میں مدد دیتے ہیں۔ کان بڑے

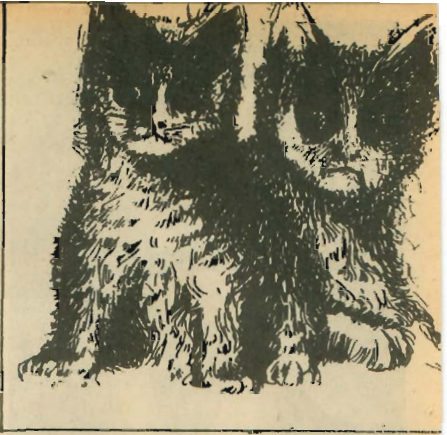

ہیں جن کو مستقل ہلا کر جسم کی حرارت ضائع کرتی ہے اور بھورا رنگ اسے ریت میں "کیمو فلاج" کرنے میں مدد دیتا ہے۔ دن بھر یہ بلّی چٹانوں کے نیچے بلوں میں دُبکی رہتی ہے۔ پانی کی زیادہ تر مقدار یہ شکار سے حاصل کرلیتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا دُشمن "صحرائی بھیڑیا" ہے۔

سرول : یہ بلّی بلحاظ جسامت عجیب سی ہے۔ مثلاً اس کے کان کافی بڑے اور سر کافی چھوٹا ہے۔ ٹانگیں بہت لمبی اور دُم کافی چھوٹی ہے۔ اپنی لمبی ٹانگوں سے یہ بہت تیز بھاگتی اور اونچا اُچھلتی ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگاسکتے ہیں کہ زمین سے اُچھل کر فضا میں نیچے منڈلاتے ہوئے پرندے کو بھی دبوچ لیتی ہے۔ افریقہ کے تقریباً" تمام جنگلات میں پائی جاتی ہے اور ہمیشہ پانی کے ذخیروں (جیسے دریا، تالاب) کے پاس گھر بناتی ہے۔ درختوں پر چڑھنے میں اسے خاص مہارت ہے اور تو اور چوہوں کو ان کے بِلوں میں سے گھُس کا نکال لیتی ہے اور کسی بھی چھوٹے ہرن کو شکار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ منہ سے "میو، میو" کی باریک آواز نکالتی ہے۔

چٹپے سروالی بلّی : لمبے کانوں کے بعد اب مختصر کانوں والی اس بلّی سے ملیئے ۔ یہ جنوب مشرقی ایشیا کی بلی ہے۔ گھریلو بلّی کے سائز کی ہی ہے۔ تاہم بہت سی باتیں مختلف بھی ہیں۔ مثلاً" اس کی کھوپڑی گول ہونے کے بجائے اوپر سے چپٹی ہے۔ عام بلّیوں کی طرح اپنے پنجوں کو کھینچ نہیں سکتی وغیرہ وغیرہ۔ یہ جوہڑوں اور دریاؤں کے کنارے رہتی ہے اس لئے کہ اس کا شکار مچھلی اور مینڈک ہیں جو یہ رات کو کرتی ہے اس کی آنکھیں کافی بڑی ہیں اور اگلے دو دانت لمبے اور نوکیلے ہوتے ہیں جو چکنے اور پھسلواں شکار پر گرفت کرنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔

ٹھیک ٹھیک بتائیں گے تب انعام پائیں گے

یہ تصویری خاکے کن شخصیات کے ہیں اور انہوں نے کون سے کارنامے سرانجام دیئے ہیں؟

(درست جواب آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

سنہرا خون

غلام حسین میمن

راولپنڈی کمپنی باغ میں زبردست چہل پہل تھی۔ آج یہاں ایک اہم جلسہ ہونے والا تھا۔ ٹھیک چار بجے وزیراعظم جلسہ گاہ میں پہنچے۔ لوگوں کی آنکھیں، ہاتھ، منہ اپنے وزیراعظم کے لئے پرجوش تھے۔ حاضرین کی تالیوں اور نعروں کی گونج میں وہ ڈائس پر آئے اور ابھی انہوں نے "برادران اسلام"..... کے الفاظ ہی ادا کئے تھے کہ ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی۔ مقرر کے سینے پر لگنے والی گولی نے انہیں کچھ اور نہیں کہنے دیا۔ وہ گر گئے۔ ٹوٹتی ہوئی سانسوں سے سننے والوں نے جو آخری الفاظ سنے وہ یہ تھے :

"خدا پاکستان ..... کی ..... حفاظت کرے۔" جیتے جی پاکستان کا درد اور مرتے ہوئے بھی اس کی فکر رکھنے والے یہ پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان تھے۔ ہندوستان میں تھے تو نواب تھے مگر جب پاکستان آئے تو خالی ہاتھ

تھے۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ آپ بھی ہندوستان میں چھوڑی ہوئی جائیداد پاکستان میں حاصل کرلیں۔ مگر ان کا جواب تھا : "جب سب کو ان کا چھوڑا ہوا مل جائے گا' تب میں بھی لے لوں گا۔"

آزادی کا سورج طلوع ہوا تو مہاجرین کے قافلے تواتر کے ساتھ پاکستان آرہے تھے۔ ان میں سے اکثر اپنے عزیزوں کی جانوں کی قربانی دے کر اور جمع پونجی سے محروم ہو کر آرہے تھے بہت سے ایسے تھے جو ہندوستان میں پھنسے ہوئے تھے اور پاکستان آنے کے متمنی تھے۔ مگر بلوائیوں کے ڈر سے سفر کرنے سے کترا رہے تھے۔ ایسے میں ہندوستان کے کسی دور افتادہ گاؤں سے وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خان کو ان کے ایک رشتہ دار کا خط ملا اس میں لکھا تھا :

"ہم پاکستان آنا چاہتے ہیں مگر یہاں پھنسے ہوئے ہیں۔ تم پاکستان کے وزیراعظم بھی ہو اور ہمارے رشتہ دار بھی' اس لئے اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلواؤ۔"

وزیراعظم پاکستان نے جواب دیا۔ "پاکستان آنے والا ہر مہاجر میرا رشتہ دار ہے اور ہر کوئی باری سے آئے گا۔ ہم کوششوں میں مصروف ہیں جب تمہاری باری آئے تو تم بھی آجانا۔"

پاکستان بننے کے بعد نئی نئی مملکت کے لئے بے پناہ مسائل تھے اور قائداعظم محمد علی جناح کے انتقال کے بعد تو ملکی مسائل اور دفاع کی تمام تر ذمہ داری قائدملت لیاقت علی خان کے کندھوں پر آگئی تھی۔ انہوں نے بہت خوش اسلوبی سے ان ذمہ داریوں کو نبھایا۔ انہوں نے پاکستان کے دفاع میں بھرپور کردار ادا کیا۔ اس سلسلے میں ان کا "مکہ" ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ جولائی ۱۹۵۱ء میں انہوں نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے فضا میں ہاتھ لہرایا اور کہا :

"بھائیو! یہ پانچ انگلیاں جب علیحدہ ہوں تو ان کی قوت ختم ہوجاتی ہے۔ مگر جب مل کر مکا بن جائے تو دشمن کا منہ توڑ سکتا ہے۔"

لیاقت علی خان سچے پاکستانی تھے بلکہ وہ پاکستان بننے سے بھی پہلے پاکستانی تھے۔ جب لندن میں منعقدہ تینوں گول میز کانفرنسیں ناکام ہوگئیں اور قائداعظم محمد علی جناح نے ہندوستان کی سیاست سے دل برداشتہ ہو کر مستقل لندن میں رہنے کا فیصلہ کرلیا۔ تو اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے کوئی متحرک اور

فعال لیڈر موجود نہیں تھا۔ یہ دَور مسلمانوں کے لئے انتہائی کسمپرسی اور بے بسی کا تھا۔ ایسے نازک وقت میں لیاقت علی خان کی قد آور شخصیت ابھر کر سامنے آئی۔ ۱۹۳۳ء میں وہ قائداعظم سے ملاقات کرنے لندن گئے۔ انہوں نے ایسے دانش مندانہ اور مسحور کن انداز میں دلائل دیئے کہ قائداعظم دوبارہ مسلمانانِ ہند کی رہنمائی کے لئے ہندوستان آنے کو تیار ہوگئے۔یہ لیاقت علی خان کا پاکستان کی تشکیل کے سلسلے میں ایک زبردست کام تھا۔کیوں کہ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو قائداعظم دیا۔اور قائداعظم نے آخر کار انہیں پاکستان دیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ قائداعظم اگر ہندوستان واپسی کا فیصلہ نہ کرتے تو آج ہماری قومی تاریخ کا کیا حال ہوتا؟

قائداعظم نے واپس آکر مسلم لیگ کی تنظیم نَو کی اور ان ہی کی ایماء پر لیاقت علی خان مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری بنے لیاقت علی خان نے اس محنت اور لگن سے کام کیا کہ قائداعظم نے مسلم لیگ کے کراچی کے اجلاس منعقدہ ۲۶ دسمبر ۱۹۴۳ء میں یہ ارشاد فرمایا :

"لیاقت علی خان میرے دستِ راست ہیں جو تحریک پاکستان اور مسلم لیگ کے لئے دن رات کام کرتے ہیں۔ یہ حقیقت شاید چند افراد کو معلوم ہے کہ انہوں نے مسلم لیگ کا کتنا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔ ان کے متعلق مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہورہی ہے کہ انہیں ہندوستان کے تمام مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہے۔"

جب مسلمانوں کا مطالبۂ آزادی زور پکڑنے لگا تو برطانوی حکومت نے ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے بعد ایک عارضی حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ اسے اقتدار باآسانی منتقل کیا جاسکے۔ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کرنے کے بعد لیاقت علی خان کو وزارت خزانہ کا قلمدان سونپا گیا۔ انہوں نے ۲۸ فروری ۱۹۴۷ء کو متحدہ ہندوستان کا وہ بجٹ پیش کیا جو "غریبوں کا بجٹ" کے نام سے مشہور ہوا۔اس بجٹ کی خاص بات یہ تھی کہ غریبوں کے استعمال کی عام اشیاء پر ٹیکس ختم کرکے غیرضروری اشیاء پر ٹیکس لگائے گئے تھے۔جن کے نفاذ سے ہندو صنعت کاروں اور ساہوکاروں میں کھلبلی مچ گئی۔ مگر غریبوں کا دم بھرنے والے وزیرِ خزانہ نے غریبوں کے مفاد کی قیمت پر کسی بھی سمجھوتے سے صاف انکار کردیا۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کے قیام پاکستان کے اعلان

کے بعد ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں انہوں نے پاکستان کا پرچم منظوری کے لئے پیش کیا۔ اس موقع پر ان کے خیالات ان کی حب الوطنی اور جمہوریت پسندی کی روشن دلیل ہیں۔ انہوں نے کہا :

"جناب عالی! کسی قوم کا پرچم محض کپڑے کا ٹکڑا نہیں ہوتا۔ وہ ان لوگوں کی آزادی اور مساوات کا ضامن ہوتا ہے جو اس سے وفاداری کا عہد کرتے ہیں۔ یہ پرچم شہریوں کے جائز حقوق کی حفاظت اور پاکستان کا دفاع کرے گا۔"

۱۹۵۱ء ہی میں ایک بار انہوں نے کہا تھا :

"میرے پاس نہ دولت ہے اور نہ جائیداد۔ صرف ایک جان ہے جو کہ چار برس سے پاکستان کے لئے وقف ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر پاکستان کی حفاظت کے لئے قوم کو خون بہانا پڑا تو لیاقت کا خون اس میں شامل ہوگا۔"

ساری دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ جو آدمی اپنے قول کا جتنا پاسدار ہے وہ اتنا ہی کامیاب ہے، وہ اتنا ہی بڑا ہے۔ یہ کامیابی اور بڑائی لیاقت علی خان کے حصے میں بھی آئی۔ انہوں نے جو کہا تھا قدرت نے اسے پورا بھی کردیا۔ ۱۹۵۱ء ہی میں اکتوبر کی ۱۶ تاریخ کو ان کا خون وطنِ عزیز کی مٹی میں جذب ہو کر اسے اور بھی قیمتی اور بھی محترم بنا گیا۔ یہ مٹی تو ویسے ہی سونا ہے سنہرے خون نے اس کی چمک دمک کچھ اور بڑھا دی۔

ایک بادشاہ نے اپنے وزیر سے کہا۔

"میرے لئے دنیا کا بہترین کھانا تیار کراؤ۔" وزیرِ باتدبیر نے زبان پکوا کر خدمت میں پیش کی۔ بادشاہ نے کہا۔

"اب دنیا کا بدترین کھانا بھی تیار کراؤ۔" وزیر نے پھر زبان پکوا کر پیش کی۔ بادشاہ بہت حیران ہوا، کہا "پھر زبان؟"

وزیرِ باتدبیر نے مؤدب ہو کر جواب دیا۔

"حضور! زبان اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ اسی سے انسان اعلیٰ ترین درجات حاصل کر سکتا ہے اور اسی سے ذلت کے گڑھوں میں گر سکتا ہے۔"

بول میری مچھلی کتنا پانی

عنایت علی خان

سنو رے لوگو! نئی کہانی
ایک ہے راجا ایک ہے رانی
راج پاٹ سب راجا کا ہے
رانی ہے بس پودا رانی
پل پل اس سے پوچھ رہی ہے
بول مری مچھلی کتنا پانی ؟

پرجا بولی پیاری رانی
دیس میں ہوگئی سخت گرانی
مہنگائی نے گاڑے جھنڈے
شور کرو تو کھاؤ ڈنڈے
ہوگئے سب کے چولھے ٹھنڈے
کس برتے پر تنا پانی
بول مری مچھلی کتنا پانی؟

راج بھون میں اک طوطا ہے
رنگت جس کی دھانی دھانی
یہ طوطا گر چونچ ہلائے

راج پاٹ چوپٹ ہوجائے
بیٹھا سر نیوڑھائے ہوتا ہے
گونگے کا گڑ کھائے ہوتا ہے
بولے تو وہ کیسے بولے
کیسے اپنی چونچ وہ کھولے
اس کو بھی ہے پیت نبھانی
اس کو بھی ہے چوری کھانی

بول مری مچھلی کتنا پانی؟

طوطا بیٹھا چوری کھائے
راجا بیٹھا بین بجائے
نوکر بیٹھا تال ملائے
رانی بیٹھی گانے گائے

بول مری مچھلی کتنا پانی

بول مری مچھلی بول مری مچھلی
کانوں میں رس گھول میری مچھلی
موقع ہے انمول مری مچھلی
ہیرے موتی رول مری مچھلی
ڈول خوشی سے ڈول مری مچھلی
بول مری مچھلی بول مری مچھلی

بول مری مچھلی کتنا پانی؟

بہادر لڑکا

اینجل کارالی چیوف

احفاظ الرحمٰن

تھریس کے علاقے میں دریائے مارتسا کے کنارے وائیوودن کا خوب صورت گاؤں ہے۔ یہاں پھلوں سے لدے سرسبز درخت ہیں اور ان کے چاروں طرف گندم کے بڑے بڑے کھیت ہیں۔ کم بلند پہاڑیوں پر انگور کے باغ ہیں' جنگ کے بعد ولکوف نے اپنی بیوی اور اپنے بیٹے ولادی کے ساتھ اسی گاؤں میں پناہ لی تھی۔

ولکوف کا گاؤں ایجین سمندر کے ساحل پر تھا۔ وہ وہاں مچھلیاں پکڑتا اور قریبی قصبے کے بازار میں لے جا کر بیچ دیتا اور اس طرح جو پیسے ملتے ان سے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا۔ جب چند غنڈوں نے اس کی کشتی ڈبو دی اور اس کا لکڑی کا پرانا کیبن سمندر میں پھینک دیا تو بدقسمت مچھیرے نے اپنا بچا کھچا سامان چھکڑے پر رکھا' چھکڑے میں گھوڑے کو جوتا اور اپنے گاؤں کو الوداع کہہ کر شمال کی طرف روانہ

ہوگیا۔ ولادی اور اس کی ماں ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے چھکڑے کے سائبان کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ ولادی بری طرح رو رہا تھا۔ اور ماں بھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ خزاں کا موسم تھا۔ تھریس کے کسان ابھی ابھی فصل کاٹ کر فارغ ہوئے تھے۔ پہاڑوں کے آس پاس انگور پک رہے تھے۔ اور چڑیوں کے جھنڈ باجرے کے پیلے پیلے کھیتوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

پناہ گیر ولکوف نے اپنا چھکڑا وائیوودان گاؤں کے قریب ایک ویران پن چکی کے قریب روکا اور گھوڑے کو کھول کر سارا سامان گھاس پر رکھ دیا۔ خاندان کے تمام لوگوں نے اپنی آستینیں چڑھائیں اور پن چکی کے پچھے کے نیچے ایک چھوٹا سا کمرہ بنانے لگے۔ انہوں نے اس پر قلعی کی اور اس میں رہنے لگے۔ ولکوف مارتسا میں مچھلیاں پکڑنے لگا۔ ولادی کو گاؤں کے اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اس نے بہت سے لڑکوں سے دوستی کرلی اور وہ اس سے محبت کرنے لگے کیوں کہ وہ بہت نڈر اور بہادر تھا۔ ولادی کی ماں اپنا کام کاج ختم کرنے کے بعد سردیوں کے لئے ضروری سامان جمع کرتی یا مچھلیوں کے جال مرمت کرتی۔

"اماں"! ولادی نے ماں سے کہا" میں نے ابھی ایک لڑکی کو زرد انگوروں سے لدی ہوئی ٹوکریاں لے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ مجھے انگور بہت اچھے لگتے ہیں ہمارے پاس اپنا انگور کا باغ کب ہوگا؟"

"صبر کرو' میرے بچے!" ماں نے جواب دیا۔ "جب تمہارا باپ مچھلیاں بیچنے بازار جائے تو اس سے کہنا وہ تمہارے لئے انگوروں کا ایک گچھا خرید لائے گا۔"

خزاں کی موسلادھار بارشوں کا زمانہ شروع ہوگیا۔ دریائے مارتسا کے کنارے ڈوب گئے اور اس کی طوفانی لہروں کے اوپر درخت' زرد کدو اور گھاس کے بڑے بڑے گٹھے بہتے نظر آنے لگے۔

ایک دن دوپہر کے وقت اسکولوں کی گھنٹی بجی۔ بچے شور مچاتے ہوئے اپنی جماعتوں سے نکلے۔ ولادی ان کے بیچ میں سے ہوتا ہوا آگے نکل گیا۔ وہ بہت جلدی میں تھا کیوں کہ اسے گھر جا کر اپنی ماں کا ہاتھ بٹانا تھا' جو نیا جال بن رہی تھی۔ جب وہ دریا کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ چیختے ہوئے دریا کے قریب بھاگ رہے ہیں۔

ولادی جلدی جلدی آگے بڑھا اور اس نے لوگوں کی بھیڑ سے جھانک کر دیکھا کہ دریا کے

بیچوں بیچ ایک ننھا سا بچہ غوطے کھا رہا ہے۔ کسی شخص میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ گہرے پانی میں اتر کر بچے کی جان بچاتا۔ بے چارا بچہ کئی بار ڈوبا اور ابھرا۔

ولادی نے بغیر سوچے سمجھے اپنا بستہ ایک طرف پھینکا اور لوگوں کو ہٹاتا ہوا دریا میں کود پڑا۔ لوگ چپ چاپ اسے دیکھتے رہے اور مچھیرے کا بیٹا ایک منٹ میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں بچہ غوطے کھا رہا تھا۔ وہ سمندر کے کنارے پل کر بڑا ہوا تھا اور مچھلیوں کی طرح تیرنا جانتا تھا۔ اچانک بچے نے غوطہ کھایا اور پھر نہیں ابھرا۔ لیکن ولادی کو معلوم تھا کہ جس جگہ بہت سارے بلبلے ابھر آئے ہیں، بچہ وہیں ہے۔ وہ اسے تلاش کرنے لگا مگر اسے یہ خوف بھی تھا کہ کہیں ڈوبتا ہوا بچہ اس کی ٹانگیں پکڑ کر اسے بھی اپنے ساتھ نہ لے ڈوبے۔ بہادر تیراک نے پانی میں ڈبکی لگائی اور دوسرے لمحے لڑکے کا بازو اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے بڑی مہارت سے پلٹا کھایا اور اس کا کپڑا پکڑ کر کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ لوگ دم سادھے دیکھتے رہے۔

آخر ولادی کنارے پر پہنچ گیا۔ اس نے لوگوں کو لڑکے کا ہاتھ پکڑایا اور خود بھی باہر نکل آیا۔ جب وہ سر سے پاؤں تک بھیگا ہوا اوپر آیا تو تمام کسان خوشی سے چیخ پڑے۔ مردوں نے پیٹھ تھپک کر اسے شاباش دی اور عورتوں نے گلے لگا کر اس کی پیشانی چوم لی۔

کچھ عورتیں ڈوبنے والے بچے کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگیں۔ انہوں نے اس کا پیٹ دبانا شروع کردیا۔ لڑکے نے جتنا پانی پیا تھا اگل دیا اور پھر آنکھیں کھول دیں۔ جب ولادی نے دیکھا کہ بچہ زندہ ہے تو اس نے اپنا بستہ اٹھایا اور چپکے سے گھر چلا گیا۔ اس کی پتلون سے پانی بہہ رہا تھا۔

اگلے دن ایک مرد اور ایک عورت جو اس بچے کے ماں باپ تھے پن چکی پر آئے۔ یہاں غریب مچھیرے کا خاندان رہتا تھا۔

بچے کے باپ نے ولادی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی ماں سے کہا :

"میں اور میری بیوی ساری رات یہ سوچتے رہے کہ تمہارے بیٹے کو کیا انعام دیں۔ ہمارا بیٹا ہی اس دنیا میں ہماری دولت ہے۔ وہ اس وقت پہلی جماعت میں ہے۔ اگر ہم اس سے محروم ہوجاتے تو ہماری زندگی ویران ہوجاتی۔ ہم اتنے مال دار تو نہیں کہ ولادی کو کچھ دے سکیں لیکن ہمارے پاس دریا کے کنارے ایک چھوٹا سا انگور کا باغ ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آدھا باغ

اس لڑکے کو دے دیں۔ جس نے ہمارے بیٹے کی جان بچائی ہے۔"

ولادی کی ماں خوشی سے چیخ پڑی۔

اس شام اسکول سے آنے کے بعد ولادی اور اس کی ماں وائیودن کے جنوب میں دریا کے کنارے پہنچے۔ ماں انگور لانے کے لئے اپنے ساتھ ایک خالی ٹوکری بھی لے گئی تھی۔

تیراک بچے مضبوط، چالاک اور صحت مند

کولون یونیورسٹی کے شعبہ کھیل نے کئی سال کی آزمائش کے بعد بچّوں کی تیراکی پر نتائج ظاہر کئے ہیں۔ یونیورسٹی کو اس آزمائش کا اختیار وزارتِ تعلیم نے دیا تھا۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ جو بچّے ابتدا سے ہی تیرنا سیکھ لیتے ہیں وہ اگرچہ ذہین ترین تو نہیں کہلاتے لیکن اپنے ہم عمر ساتھیوں کی نسبت، جنہوں نے تیرنا نہیں سیکھا ہوتا ہے، زیادہ تیزی سے اپنے ذہن کو استعمال کرتے ہیں، انہیں اپنی حرکات پر کنٹرول ہوتا ہے، جسمانی ساخت زیادہ تیز ہوتی ہے۔ وہ چالاک، تیز، بہادر اور آسانی سے دوسروں میں گھُل مِل جاتے ہیں۔

ان نتائج کی بنا پر اس ملک اور دوسرے ممالک میں بچّوں کے لئے تیراکی کے کورسز مستقبل قریب میں اور زیادہ مقبول ہوں گے۔ ہمبرگ میں تیراکی کے اُستاد نے چار سال کے بچّوں کو قمیض اور جینز میں تیراکی کروائی تاکہ اگر کبھی وہ اچانک پانی میں گر جائیں تو صحیح طور پر تیر سکیں۔

ناقابلِ یقین

بقول "نیشنل انکوائرر"
یہ واقعہ امریکہ میں
پیش آیا۔ خشک مٹی
کا ایک پہاڑی تودہ گرنے
کے بعد دھول اور مٹی کا
طوفان جو اٹھا تو دیکھتے ہی دیکھتے
اس دھول نے ایک خوفناک
انسانی شکل اختیار کرلی۔ اس
منظر کو دیکھتے ہی لوگ چیختے چلاتے
اِدھر اُدھر بھاگ نکلے۔ اس لمحے کو
ایک چوکس فوٹو گرافر نے فوراً
ہی کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرلیا۔
امریکی آج کل پوری دنیا کو ایسے
ہی خوفناک چِتر دکھا رہے ہیں۔

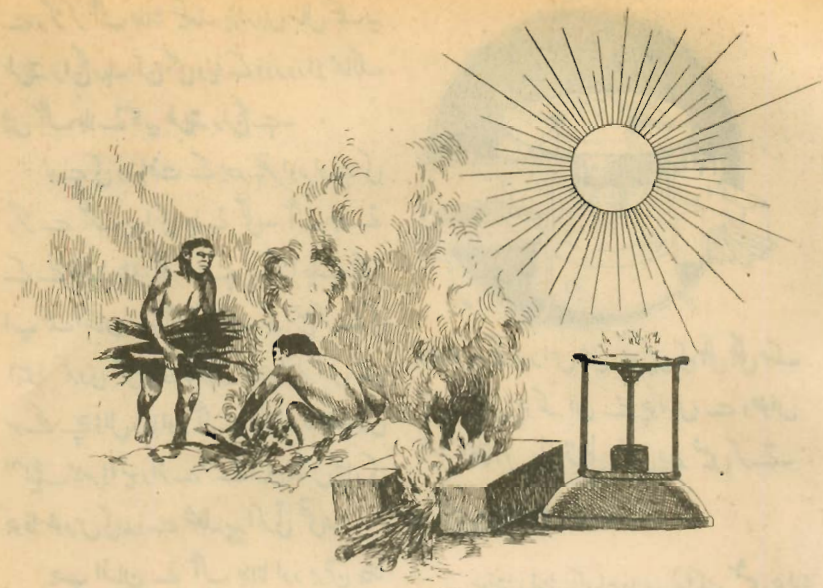

چولہے کس طرح ایجاد ہوئے

از: امتہ واحد بخش

پُرانے زمانے میں جب انسان کو معلوم نہیں تھا کہ یہ آگ کیا ہے تو وہ اس سے ڈرا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے آگ پر قابو پانا اور اسے استعمال کرنا سیکھ لیا۔ آگ کی دریافت کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ پہلی آگ بجلی سے درختوں اور جھاڑیوں میں لگی ہوگی۔

ابتدا میں انسان نے اس کو دیوتا جان کر عبادت کی۔ پھر انسان نے سردی سے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے آگ کے اِردگرِد بیٹھنا شروع کیا۔ خطرناک جانوروں سے خود کو دور رکھنے کے لئے بھی اس نے الاؤ روشن کئے۔

شروع شروع میں اس نے آگ کو جلائے رکھنے کا نرالا طریقہ نکالا جب بھی آگ بجھنے لگتی وہ اس میں لکڑیاں وغیرہ ڈال کر الاؤ کو روشن کردیتا۔ اس کے علاوہ آگ کو حفاظت سے راکھ میں بھی دبایا جانے لگا۔ پھر انسان نے پتھر کو پتھر

سے رگڑ کر آگ جلانا سیکھا۔ ہزاروں سال تک یہ طریقہ رائج رہا۔ آج بھی دنیا کے دور دراز ممالک میں آگ جلانے کا یہ طریقہ رائج ہے۔

لوہے کی دریافت کے بعد پتھر اور لوہے کی رگڑ سے آگ پیدا کی جانے لگی۔ آگ جلانے کے لئے فلنٹ نامی پتھر کو لوہے پر رگڑا جانے لگا۔ اب تک انسان نے آگ کو ایک جگہ جمع کرنے کی ابتدا کردی تھی۔ وہ پتھروں کو جوڑ کر اس میں سوکھے پتے ڈال دیتا اور آگ جلا لیتا۔ ۱۹۰۵ء میں "کیگ میسرڈائیوراٹرے" نے ایسی ماچس تیار کی جو فاسفورس کی مدد سے شعلہ پیدا کرتی تھی۔

جب انسان نے آگ جلانا اور برتن بنانا سیکھا تو اس کی عقل بڑھ چکی تھی۔ وہ آگ کو محفوظ جگہ اسٹور کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے مٹی اور پتھر کے چولہے تیار کرنے شروع کردیئے۔ تیل کی دریافت کے بعد انسان نے پہلے دیئے بنانے سیکھے۔ پھر بتی والا چولہا بنانے کی کوشش کی۔ گیس کی دریافت کے بعد اس نے قسم قسم کے چولہے بنانے شروع کئے۔

دھواں نہ دینے والے چولہے :

بھارتی سائنس دانوں نے جو دھواں نہ دینے والے چولہے تیار کئے ہیں وہ شمال مشرقی علاقوں کے سوا پورے ملک میں مقبول ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ قبائلی ایسے گوشت کو پسند کرتے ہیں جسے

دھواں لگے اور اس میں دھوئیں کی ہلکی ہلکی مہک آئے۔ لیکن چونکہ ان نئے چولہوں سے دھواں نہیں نکلتا اس لئے قبائلی انہیں پسند نہیں کرتے۔

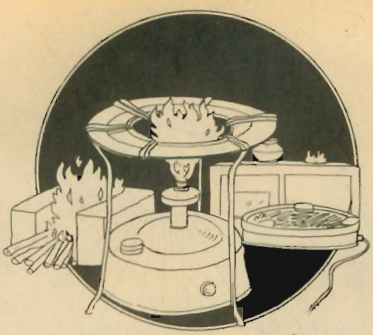

شمسی چولہا :

سوئٹزرلینڈ کے ماہروں نے ایک شمسی چولہا تیار کیا ہے۔ جس کی مدد سے گوشت پکایا جاسکتا ہے اور چائے بھی تیار کی جاسکتی ہے۔ یہ چولہا انتہائی سادہ ہے اور اس میں ایلومونیم کے دو ریفلیکٹر نصب ہیں۔ جن کی مدد سے سورج کی کرنوں کو ایک نکتے پر مرکوز کیا جاتا ہے۔ اس نکتے پر ان کرنوں کی حدت اس قدر زیادہ ہوجاتی ہے کہ ہر قسم کا کھانا آسانی کے ساتھ پک جاتا ہے۔ ریفلیکٹر کو پانچ منٹ کے بعد انگلی سے ہٹانا پڑتا ہے تاکہ سورج کی کرنوں کا انعکاس ایک جگہ مرتکز رہے۔ اس شمسی چولہے کو "سن برگ" کا نام دیا گیا ہے اسے کیمپ، باغ، پہاڑوں اور مکانوں کی چھت پر استعمال کیا جاتا ہے۔

نیچے دیئے ہوئے خانوں میں ہو بہو اوپر کے خانوں والی تصویر اس طرح بنائیے کہ ان کی ترتیب بالکل درست ہو جائے۔ پھر ان میں رنگ بھریئے اور گھر کے کسی فرد کو دکھا کر ۱۰۰ میں سے نمبر حاصل کیجیے۔ ۶۰ نمبر مل گئے تو گویا آپ ڈرائنگ کے امتحان میں اول۔

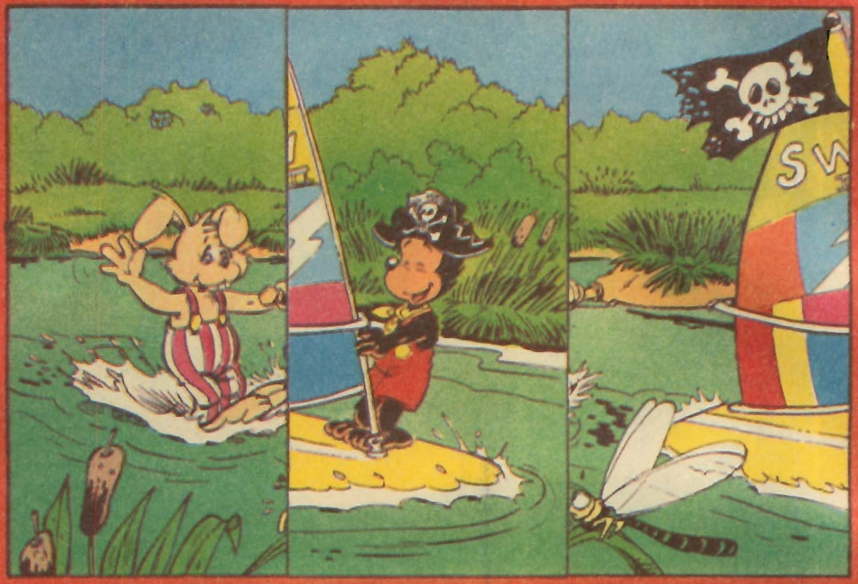

م... مم... مم... مُرمُر... مُردہ

منجمد کر دینے والی ٹھنڈ میں اکڑا ہوا انسانی جسم سائنسدانوں کی تحقیقی سرگرمیوں کا منتظر ہے۔

ثابت و سالم ریڑھ کی ہڈی،
لیکن تین پسلیاں ٹوٹی ہوئی
یہ ہے پانچ ہزار سالہ انسان کے سینے کا ایکس رے۔

مردہ بدست زندہ "دیکھیں یہ لوگ میرا کیا بناتے ہیں!"

پانچ ہزار سال قدیم لاش کی پشت کا ایک کلوز اپ

یہ سہ جہتی تصاویر بتاتی ہیں کہ اس کھوپڑی کے اندر ۱۵۰۰ مکعب سینٹی میٹر گنجائش کی جگہ تھی جس میں یقیناً دماغ موجود تھا ذرا بتائیے آپ کی کھوپڑی کے اندر کتنی گنجائش ہے

پانچ ہزار سال سے خوابیدہ انسان

شاید آپ مجھے جانتے نہ ہوں۔ مجھ سے ملئے، میں ہوں آج سے پانچ ہزار سال قبل کا ایک انسان جسے قدرت نے برف میں محفوظ کردیا تھا۔ اس لئے کہ آج کے سائنسداں میرے وجود، میرے رہن سہن وغیرہ کے بارے میں سوچ سوچ کر حیران اور زیادہ حیران ہوتے ہیں۔ کئی برسوں سے وہ اسی بحث میں مصروف ہیں کہ میں کن حالات میں زندگی گزارتا تھا، کیا کھاتا پیتا تھا، کیا پہنتا اوڑھتا تھا؟ آپ تو شاید یہ بھی نہیں جانتے ہوں گے کہ میرے جسم کو انہوں نے ایک بڑے فریزر میں محفوظ رکھا ہوا ہے اور صرف مجھے محفوظ رکھنے پر انہیں ہر ماہ دس ہزار ڈالر خرچ کرنا پڑتے ہیں۔ اٹلی اور آسٹریلیا میں تو اس بات پر تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ میرے جسم کو کس ملک کی سرحدوں میں دریافت کیا گیا ہے۔ ایک منٹ! ذرا اپنا کان ادھر لائیے ..... آپس کی بات ہے، یہ تو خود مجھے بھی نہیں معلوم!

پیٹو

ضیاء الحسن ضیاء

جب کوئی لیتا ہے میرے سامنے کھانے کا نام
اس جگہ سے میں کبھی لیتا نہیں جانے کا نام

مجھ کو دعوت میں بلا لینا بہت آسان ہے
میں نے پیٹو رکھ لیا ہے اپنے کاشانے کا نام

حلوہ سوہن کھاؤں من بھر تو کہیں آئے قرار
ٹافیاں تو ہیں فقط اس دل کے بہلانے کا نام

کھانے والوں میں مری شہرت ہے ایسی دوستو
جس طرح مشہور ہے دنیا میں پروانے کا نام

سر منڈاتے ہی پڑے ہیں کس قدر اولے ضیاء
اب کبھی لوں گا نہ، ہرگز سر کو منڈوانے کا نام

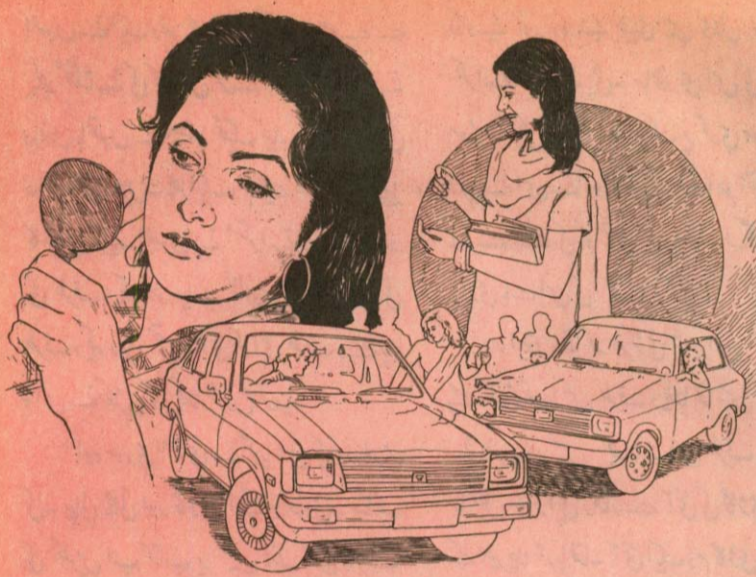

محمد جاوید خالد

سردی

"چلیں آنٹی، دیر ہورہی ہے۔" صائمہ گھڑی دیکھتے ہوئے بلند آواز سے بولی۔ "دیر ہوگئی تو پھر رول نمبر تلاش کرنا، جگہ ڈھونڈنا بھی ایک مسئلہ بن جائے گا۔" وہ بڑبڑائی۔ صائمہ گیارہویں جماعت کی طالبہ تھی۔ اس کے امتحانات شروع ہوگئے تھے اور آج اس کا پہلا پرچہ تھا۔

"چلیں بھئی چلیں۔" ٹھک ٹھک کرتی دوسرے کمرے سے آنٹی برآمد ہوئیں۔ ایک ہاتھ سے بالوں کو تھپتھپاتے ہوئے انہوں نے ایک نظر آئینے میں اپنا عکس دیکھا اور اسی رفتار سے ٹھک ٹھک کرتے ہوئے وہ گاڑی کی طرف بڑھ گئیں۔ صائمہ ہاتھ میں کتاب پکڑے ان کے پیچھے پیچھے تھی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انہوں نے ڈیش بورڈ سے اپنا چشمہ اٹھایا۔ آنکھوں پہ چشمہ لگا کر

انہوں نے ایک دفعہ پھر آئینہ دیکھا۔ دھیرے سے کچھ گنگنانے کی کوشش کرتے ہوئے انہوں نے دونوں ہاتھوں سے چشمہ ٹھیک کیا۔ کچھ دیر وہ اسی حالت میں رہیں۔ پھر ایک دم جیسے انہیں کسی چیز کا خیال آگیا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے صائمہ کی طرف دیکھا جو سپاٹ نظروں سے ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آنٹی کو اپنی طرف دیکھتے پایا تو اس نے گھڑی کو دیکھنا شروع کردیا۔

"اوہ سوری۔" آنٹی نے گویا اس کی دلداری کی۔ چابی لگائی اور گاڑی آگے بڑھادی۔ صائمہ کی نظریں اب کتاب پر تھیں جبکہ آنٹی پھر سے کچھ گنگنانے کی کوشش میں مصروف ہوگئی تھیں۔ صائمہ کے جی میں آیا کہ انہیں روکے۔ روک نہ سکے تو ٹوک ہی دے۔ "مگر ہوگا کیا؟" اس نے سوچا۔ "سوری!!!" اور کچھ دیر بعد پھر وہی۔ اس نے اپنی توجہ کتاب پر مرکوز کردی۔ وہ اپنے یاد کیے ہوئے کو جلد از جلد دہرانا چاہتی تھی۔ غیر ارادی طور پر بائیں طرف کو جھکتے ہوئے اس نے اندازہ لگایا کہ کوئی موڑ آیا ہے۔ اس نے نظریں اٹھائیں تو معلوم ہوا کہ آنٹی ذیلی سڑک سے مرکزی شاہراہ پر آگئی ہیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ گاڑی مکمل طور پر سیدھی ہوتی ایک دھماکے کی آواز آئی۔ آنٹی نے بے ساختہ بریک لگادیئے اور وہ بے خیالی میں ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ ساتھ ہی اس کی نظر اس موٹر سائیکل پر پڑی جو سڑک پر گری ہوئی تھی۔ اس نے اس کے سوار کو بھی دیکھا جو ہتھیلیوں کی مدد سے اٹھنے کی کوشش کررہا تھا۔ اگلے ہی لمحے ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔

ہوا یوں تھا کہ مرکزی شاہراہ پر آنے سے پہلے آنٹی کو دائیں طرف دیکھنا تھا جس کو انہوں نے ضروری نہیں سمجھا جبکہ اس طرف سے موٹر سائیکل سوار اپنی رفتار سے آنٹی کی گاڑی کی توقع کیے بغیر چلا آرہا تھا۔ آنٹی ایک دم گاڑی سڑک پر لے آئیں تو بریک لگاتے لگاتے بھی وہ غریب کار سے ٹکرا گیا۔ دھماکے کی آواز اسی ٹکرانے کا نتیجہ تھی اور اس نتیجے کا نتیجہ زمین پر گری ہوئی موٹر سائیکل اور اس کا سوار تھے۔ وہ تو شکر ہوا کہ صبح سویرے ٹریفک بہت زیادہ نہیں تھا ورنہ ٹریفک کے بہاؤ میں موٹر سائیکل سوار کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ اب وہ لنگڑاتا ہوا کار ہی کی طرف آرہا تھا۔ آنٹی کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔

چند لمحے وہ ان کی طرف دیکھتا رہا جیسے فیصلہ کررہا ہو کہ اس عورت سے کیا کہے کیا نہ کہے۔ موٹر سائیکل والا چہرے مہرے سے شریف آدمی

معلوم ہوتا تھا۔ وہ بولا تو اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔ اس نے صرف اتنا کہا "محترمہ! آپ پر تو یہ واجب ہی نہیں کہ آپ گاڑی چلاتے ہوئے دائیں بائیں بھی دیکھ لیں۔"

آناً" فاناً" لوگ اکٹھے ہوگئے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ موٹر سائیکل والے نے کچھ کہا ہی نہیں تو وہ خود ہی کار کے گرد جمع ہوگئے۔ صائمہ پریشان ہوگئی کیونکہ ایک تو اسے یہ خوف تھا کہ اب خدا جانے کیا ہوگا۔ دوسرے اسے پرچے کی فکر تھی۔ جمع ہونے والوں میں ایک شخص نے آنٹی کو خوب ڈانٹ پلائی۔ اس نے سنا وہ کہہ رہا تھا۔"بس آپ "سوری" کہہ کر دست بردار ہوگئیں۔ اب نہ آپ کو یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ موٹر سائیکل کتنی ٹوٹی ہے نہ اس بات کی فکر ہے کہ اس کے سوار کو کتنی چوٹ لگی ہے بس سوری....." پھر وہی شخص تیزی سے موٹر سائیکل والے کی طرف لپکا۔ لیکن اس نے اطمینان کرلیا تھا کہ کار نکلنے نہ پائے۔ اس نے موٹر سائیکل کو دیکھا اور اس کے سوار سے پوچھا کہ اسے کہاں چوٹ لگی ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے؟ اس نے اسے موٹر سائیکل چیک کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ لیکن موٹر سائیکل والا واقعی شریف آدمی تھا۔ اس نے کہا۔"میں ٹھیک ہوں، معمولی خراشیں ہیں اور موٹر سائیکل بھی تقریباً" ٹھیک ہی ہے۔ کار کو جانے دیا جائے۔"

کار آگے بڑھی تو اس نے سکون کا سانس لیا مگر اس سے لمبا سانس آنٹی کا تھا۔ "توبہ ہے۔" شیشہ چڑھاتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "کیسے غصے بھری نظروں سے سب مجھے گھور رہے تھے۔ اب ایسے چھوٹے موٹے واقعات تو ہوتے ہی رہتے ہیں اور پھر میں نے "سوری" بھی تو کرلیا تھا، جیسے میری "سوری" کی کوئی اہمیت ہی نہیں اونہہ..... کیوں صائمہ؟" وہ اس کی طرف گھومیں تو صائمہ نے بھی نظریں ملائیں چند لمحے تو وہ انہیں دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ آواز سے بولی۔ "جی آنٹی "سوری" کی بہت اہمیت ہے اور پھر آپ کی زبان سے!!"

کالج کے سامنے کار سے اترتے ہوئے اس نے آنٹی کو یاد دلایا کہ بارہ بجے پرچہ ختم ہوجائے گا اور وہ سوا بارہ بجے تک پہنچ جائیں۔ سر ہلاتے ہوئے آنٹی نے گاڑی موڑی اور وہ تیزی سے اس بورڈ کی طرف بڑھ گئی جس پر رول نمبر اور کمروں کی تفصیل درج تھی۔

پرچہ دے کر نکلی تو وہ صبح کے مقابلے میں بہت خوش گوار موڈ میں تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اس کا پرچہ بہت اچھا ہوگیا تھا۔ کالج

کے سامنے ہی آنٹی کو گاڑی سمیت دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں اور وہ بڑے مسرور انداز میں اپنی سہیلیوں سے اگلے پرچہ پر تبادلہ خیال کرنے لگی۔

"چلو بھئی صائمہ" اگلے ہی لمحے آنٹی نے کھڑکی سے سر نکال کر بلند آواز سے کہا "مجھے دیر ہو رہی ہے، مسز خان کے ہاں لنچ پر بھی جانا ہے" صائمہ کی سہیلیاں آنٹی کی تیز آواز سن کر خود ہی اِدھر اُدھر ہو گئیں اور وہ آہستہ قدموں سے کار کی طرف بڑھی۔ آنٹی کی نظریں بار بار کلائی پر بندھی گھڑی کی جانب جا رہی تھیں۔ اس کے کار میں بیٹھتے ہی انہوں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ "دیر ہو گئی" انہوں نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ صائمہ نے دیکھا کہ آنٹی کپڑے وغیرہ بدل کر تیار ہو کر آئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ صائمہ کو گھر پر اتارتے ہی روانہ ہو جائیں گی۔

"سوری آنٹی" اس نے بے خیالی میں کہا تھا مگر آنٹی نے اس طرح چونک کر اسے دیکھا جیسے وہ ان پر طنز کر رہی ہو۔ صائمہ کو باہر جھانکتے دیکھ کر وہ بھی سیدھی ہو گئیں۔ صائمہ اپنے خیالوں میں تھی کہ ایک دفعہ پھر دھماکے کی آواز نے اس کی سارے خیالات منتشر کر دیئے۔ "خدا خیر کرے" وہ بڑبڑائی مگر اس کا بڑبڑانا اس پُر شور آواز میں دب گیا جو دروازے کے بند ہونے سے پیدا ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا آنٹی بہت غصے کے عالم میں کار سے اتری تھیں اور تیزی سے کھٹ کھٹ کرتے ایک دوسری گاڑی کے سامنے کھڑی ہو گئی تھیں۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک نوجوان بڑی لاپروائی کے انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ اب صائمہ پر صبح جیسی اضطرابی کیفیت تو طاری تھی نہیں، صورت حال جاننے کے لئے اس نے دروازہ کھولا اور خود بھی گاڑی سے اتر گئی۔ آنٹی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا وہ نوجوان کو گھور رہی تھیں اور نوجوان بڑے اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔

"تمہیں شرم نہیں آتی؟" وہ نوجوان کو غصہ بھری نظروں سے گھورتے ہوئے زور سے بولیں۔ "آتی ہے" نوجوان نے اسی اطمینان سے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

صائمہ کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی مگر وہ آنٹی کے خوف سے ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ اور آنٹی ..... آنٹی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس نوجوان کو کچا چبا جائیں۔

"تمہیں ..... تمہیں مرنے سے پہلے سیدھے ہاتھ پر نہیں دیکھنا چاہئے تھا؟" وہ غرائیں "چاہئے تو تھا مگر میرا دھیان اس طرف تھا" اس

نے جھک کر ٹیپ بند کرتے ہوئے ویسے ہی آرام سے انہیں جواب دے دیا۔ اب صائمہ کی سمجھ میں ساری بات آگئی تھی۔ "یہ تو بالکل صبح والا قصہ ہے۔" وہ بڑبڑائی۔ "اتنی جلدی' بالکل وہی۔" اس کے ساتھ ہی وہ پھر دھیرے سے مسکرادی۔ ساری صورت حال وہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ صبح جو کام آنٹی نے کیا تھا وہی اب اس نوجوان سے سرزد ہوا تھا۔ نوجوان کے پاس زیادہ بڑی گاڑی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ آنٹی کی گاڑی کی نہ صرف یہ کہ الٹے ہاتھ کی لائٹ ٹوٹ گئی تھی بلکہ وہ کونے سے بری طرح دب بھی گئی تھی۔ اتنے حصے سے گاڑی کا رنگ الگ ادھڑ گیا تھا۔ آنٹی ہونٹ کاٹتے ہوئے ایک نظر اس نوجوان کو دیکھ رہی تھیں اور ایک نظر اپنی گاڑی کے پچکے ہوئے حصے کو۔ آنٹی کی نظروں کے تعاقب میں نوجوان نے بھی گاڑی کے متاثرہ حصے کا جائزہ لیا۔ سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹ سکیڑ کر اس نے ڈیش بورڈ سے ایک کارڈ اٹھایا اور اسی لاپروائی سے آنٹی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا :

"یہ میرا کارڈ ہے۔ گاڑی میرے ورکشاپ پر لے آیئے گا ٹھیک کروادوں گا اور اب اپنی گاڑی کو ذرا سا پیچھے کرلیں تاکہ میں گاڑی نکال لوں۔"

آنٹی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس نوجوان سے کیا سلوک کریں؟ اس کا کارڈ والا ہاتھ ویسے ہی بڑھا ہوا تھا۔

"شاید آپ ابھی تک ناراض ہیں۔" اس کی مسکراہٹ بھی تاؤ دلانے والی تھی۔ "اچھا سوری۔" اس نے کہا۔

آنٹی کی پوزیشن میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

"بڑی نواب ہیں بھئی آپ بھی۔ سوری بھی کرلیا ہے اب تو میں نے' اور آخر آپ کیا چاہتی ہیں؟" اور اس کے ساتھ ہی اس نے کارڈ کو آنٹی کے چہرے کی طرف اچھال دیا۔ آنٹی نے سخت غصے سے ہاتھ جھٹکا۔ کچھ کہنے کے لئے انہوں نے منہ بھی کھولا۔ دو چار لوگ وہاں بھی جمع ہو رہے تھے۔ نوجوان سیدھا ہوا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کرکے پیچھے کی اور پھر تیزی سے موڑتے ہوئے جو زن سے نکلا ہے تو ایک دن پہلے ہونے والی بارش کا جمع شدہ پانی بھی فوارے کی طرح اچھلا۔ لوگ جو اکٹھا ہو رہے تھے جلدی سے دائیں بائیں ہوگئے۔ خود صائمہ بھی اچھل کر ایک دم پیچھے ہوگئی مگر آنٹی کو غصے نے کچھ سمجھنے ہی نہیں دیا۔ وہ بے ساختہ تھوڑی سی پیچھے بھی ہوئیں تو پشت پر خود ان کی اپنی گاڑی کھڑی

نی۔ صائمہ کی تو چیخ ہی نکل گئی۔ گاڑی سے
ڑنے والے گندے پانی نے آنٹی کے نئے
نگدار کپڑوں پر وہ نقش و نگار بنائے تھے کہ خدا
ی پناہ! اس نے گھبرا کر آنٹی کے چہرے کی
طرف دیکھا۔ کچھ چھینٹوں نے وہاں بھی ایک اور
یک اپ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب وہ لوگ
ھی جمع ہو رہے تھے جو جانے والی گاڑی کے
پیوں کی تیز آواز سے چونکے تھے۔ صائمہ نے
کارڈ دیکھنے کی کوشش کی مگر اس افراتفری نے
سے بھی جانے کہاں اور کس حال میں پہنچا دیا
تھا؟

سخت ہمت کرکے وہ آنٹی کے قریب پہنچی
اور آہستہ سے بولی۔ "اب چلیں آنٹی۔" آنٹی نے
اسے گھور کر دیکھا لیکن ساتھ ہی ان کی نظر اپنے
حلیے پر پڑی پھر جمع ہونے والے لوگوں پر۔
ونٹ سختی سے دبائے ہوئے وہ مڑیں۔ زور دار
آواز سے دروازہ بند کیا اور ایک جھٹکے سے گاڑی
آگے بڑھا دی۔ صائمہ سنبھلتے سنبھلتے بھی آگے
جھک گئی۔ گاڑی آندھی کی طرح اڑتی جا رہی
تھی اور صائمہ کا مارے خوف کے رنگ فق ہو رہا
تھا۔

"آنٹی آہستہ....." ایک موڑ پر وہ بول ہی اٹھی۔

"چپ رہو۔" آنٹی نے اسے جھڑک دیا۔

"آنٹی میں نے تو کچھ نہیں کیا۔" صائمہ روہانسی
ہو گئی۔

"میں کہتی ہوں چپ۔" آنٹی غصے سے دھاڑیں۔

"سو..... سوری۔" اس کے منہ سے بے ساختہ
نکلا۔

"کیا؟" وہ پھٹ پڑیں۔ گاڑی کو ایک دم جھٹکا
لگا۔ "میرا مذاق اڑا رہی ہو؟"

"نن..... نہیں تو!!" صائمہ ایک دم بدحواس
ہو گئی۔

آنٹی نے منہ کو ایک دفعہ پھر سختی سے بند
کرلیا۔ کچھ دیر کے بعد صائمہ نے چور نظروں
سے ان کو دیکھا۔ آنٹی کے غصیلے چہرے پر میک
اپ نے اور میک اپ پر گندے پانی کے چھینٹوں
نے بڑی مضحکہ خیز صورت حال پیدا کر دی تھی۔
وہ مسکرانا چاہتی تھی مگر آنٹی کی دہشت غالب
آگئی۔ اس نے دونوں ہاتھ سختی سے منہ پر رکھ
لئے۔ تھوڑی ہی دیر میں گھر آگیا۔ اس نے
دروازہ کھولا اور بھاگتی ہوئی سیدھی اپنے کمرے
میں گھس گئی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا منہ کئی
دنوں سے بند رہ رہ کر سوج گیا ہو۔ اس نے جلدی
جلدی دو تین بار منہ کھولا، بند کیا اور پھر بے
ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ اسے اس بدتمیز
نوجوان پر شدید غصہ تو تھا اور اس کی بدتہذیبی پر

افسوس بھی۔لیکن آنٹی کے ساتھ اتنی جلدی "جیسے کو تیسا" ہوجائے گا اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ آنٹی اور ان کے حلیے کا خیال آیا تو وہ باوجود افسوس کے ایک بار پھر ہنس پڑی۔ آہٹ سن کر گھومی تو دروازے پر اس کی امی حیران کھڑی تھیں۔ "کیا ہوا بھئی....." وہ اندر آتے ہوئے بولیں۔"پرچہ دے کر آئی ہو اور پاگلوں کی طرح ہنس رہی ہو اور گاڑی کیسے اندر آگئی؟ نجمہ تو کہہ رہی تھی کہ وہ تمہیں گیٹ پر ہی اتار کر چلی جائے گی۔ اسے کسی پارٹی میں جانا تھا۔"

پارٹی کے ذکر پر صائمہ ایک دفعہ پھر ہنسی مگر اچانک اس کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔ دروازے پر آنٹی کھڑی اسے گھور رہی تھیں۔

"وہ.....وہ آنٹی سی.....سوری۔"

"شٹ اپ!!!" آنٹی حلق کے بل چیخیں۔

صائمہ نے سختی سے دونوں ہاتھ منہ پر رکھے اور دوسرے دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی۔

کس کی مجال ہے جو مجھے کچھ بھی کہہ سکے
کتّے کی دوستی کا یہ اک فائدہ تو ہے

☆ --- ☆ --- ☆

انسائیکلوپیڈیا آف برٹینیکا دنیا کی مستند ترین حوالہ جاتی کتاب ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹینیکا کی پہلی اشاعت 1768ء میں عمل آئی۔ اس کا پہلا ایڈیشن 100 اقساط پر مشتمل تھا جو 1771ء میں مکمل ہوا۔

☆ --- ☆ --- ☆

انسائکلوپیڈیا آف امریکانہ Encyclopaedia Of Americana بھی ایک معروف حوالہ جاتی کتاب ہے جو دنیا کے تمام موضوعات سے متعلق جامع معلومات فراہم کرتی ہے۔یہ انسائیکلو پیڈیا پہلی بار 1829ء میں شائع کیا گیا اس وقت یہ انسائکلوپیڈیا 13 جلدوں پر مشتمل تھا۔ انسائکلوپیڈیا آف امریکانہ کی ان 13 جلدوں کی اشاعت 1833ء میں مکمل ہوئی۔

☆ --- ☆ --- ☆

مشہور انسائکلو پیڈیا (World Book) سے علمی حلقے پہلی بار 1917ء میں متعارف ہوئے۔ 1917ء میں پہلی اشاعت پر یہ انسائکلو پیڈیا 8 جلدوں پر مشتمل تھا۔ 1961ء کا سال "انسائکلو پیڈیا" کی تاریخ میں کافی اہمیت اختیار کر گیا۔ اس سال دنیا میں پہلی بار انسائکلو پیڈیا نابینا افراد کی سہولت کے لئے "بریل سسٹم" میں بھی شائع کیا گیا اور یہ اعزاز ورلڈ بک (World Book) کو حاصل ہوا۔

☆ --- ☆ --- ☆

اسٹاک ایکسچینج کسی بھی ملک کی معیشت کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ اسٹاک ایکسچینج کا بنیادی مقصد مختلف صنعتی اور تجارتی اداروں کے شیئرز یا حصص کی خرید و فروخت ہے۔ لندن اسٹاک ایکسچینج کو دنیا کے پہلے اسٹاک ایکسچینج ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس کا قیام 1801ء میں عمل میں آیا۔

☆ --- ☆ --- ☆

زمبابوے کے پہلے منتخب صدر ہونے کا اعزاز رابرٹ موگابے کو حاصل ہے۔ رابرٹ موگابے کا شمار زمبابوے کی سیاسی جماعت "زمبابوے افریقن نیشنلسٹ یونین" کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ رابرٹ موگابے 1925ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم سالسبری کے تعلیمی ادارے میں جبکہ اعلیٰ تعلیم فورٹ ہیر (Forthare) یونیورسٹی سے حاصل کی۔ وہ 1980ء کے عام انتخابات میں پہلی بار زمبابوے کے صدر منتخب ہوئے۔

☆ --- ☆ --- ☆

کینیا براعظم افریقہ کے شمالی حصے میں واقع ایک خوبصورت ملک ہے اور اپنے قدرتی حسن کی وجہ سے (Blue Grass State) کے نام سے معروف ہے۔ جو موکینیاٹا کو کینیا کے پہلے صدر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ 1964ء میں کینیا کے صدر منتخب ہوئے اور 1978ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔

☆ --- ☆ --- ☆

قوت سماعت سے محروم افراد کو علم کے زیور سے آراستہ کرنے کے لئے دنیا کا پہلا تعلیمی ادارہ 1760ء کو پیرس میں ایب چارلس مائیکل (Abbe Charles Michel) نے قائم کیا۔ انگلی کے اشاروں کے ذریعے مختلف حروف کے اظہار کا طریقہ بھی ایب چارلس مائیکل ہی کی دریافت ہے۔

☆ --- ☆ --- ☆

ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف کو پاکستان کی پہلی خاتون وائس چانسلر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ انہوں نے نہ صرف پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلر کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیئے بلکہ وہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی پہلی خاتون سربراہ کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دے چکی ہیں۔

☆ --- ☆ --- ☆

لیفٹیننٹ کمانڈر ایلن شیپرڈ کو امریکہ کے پہلے خلا باز ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ انہیں 5 مئی 1961ء کو امریکہ کی تاریخ کی پہلی انسان بردار خلائی پرواز کے ذریعے خلاء میں بھیجا گیا۔

☆ --- ☆ --- ☆

18 جون 1965ء کو الجزائر میں پہلی بار فوجی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ جب الجزائر کی مسلح افواج کے کرنل حواری بومدین نے ملک کے پہلے صدر بن باللہ کی حکومت کا خاتمہ کر کے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔

☆ --- ☆ --- ☆

دنیا میں پہلی بار ٹریولرز چیک (Traveler's Cheque) برطانیہ سے جاری کئے گئے۔ یہ ابتدائی ٹریولرز چیک لندن اسٹاک ایکسچینج کے ایک اعلیٰ عہدیدار رابرٹ ہیرس (Robert Harries) کی کوششوں کے نتیجے میں جاری ہوئے۔ یہ ٹریولرز چیک نقد رقم کے متبادل کے طور پر دنیا کے تقریباً 90 شہروں میں قبول کئے جاتے تھے۔ رابرٹ کے متعارف کردہ ایک ٹریولرز چیک کی مالیت بیس پونڈ تھی جس کی گمشدگی یا چوری ہونے کی صورت میں رقم کے تحفظ کی مکمل ضمانت تھی۔

☆ --- ☆ --- ☆

کیسے کیسے حالات

ارشد نواز، کوہاٹ

حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ کبھی کبھی لگ بھی جاتی ہے اور وہ اتنی ہوتی ہے کہ انسان عادی ہوجاتا ہے۔ گویا حالات نہیں بدلتے تو انسان بدل جاتا ہے۔ ہمارے ایک دوست کو کراچی کے حالات پر بڑی تشویش رہتی ہے۔ ایک دن اس نے کہا کہ لگتا ہے کہ کراچی میں "امن" آگیا ہے۔ میں نے کہا کہ نہیں ابھی مکمل نہیں آیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کراچی کے حالات کا عادی ہوجائے گا لیکن نہیں وہ آج بھی حالات کا رونا روتا رہتا ہے۔ ثابت ہوا کہ حالات کی ایک قسم وہ بھی ہے کہ جس میں حال اور انسان دونوں نہیں بدلتے۔

حالات ہی آدمی کو کچھ نہ کچھ بنادیتے ہیں اور حالات ہی آدمی کو کچھ بھی نہیں بننے دیتے مثلاً" میں۔ مجھے بچپن ہی سے لکھنے کا شوق تھا۔ آج بھی ہے سو لکھتا جارہا ہوں۔ کیا لکھتا ہوں یہ مجھے بھی معلوم نہیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میں مستقبل میں ایک بہت بڑا مصنف بنوں گا مگر میں بڑا مصنف تو کیا چھوٹا بلکہ چھوٹا موٹا بھی نہ بن سکا

کیوں کہ یہ حالات ہی ہیں جنہوں نے مجھے کچھ نہیں بنایا۔

کچھ لوگ حالات کی وجہ سے نیک اور کچھ بدمعاش بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو "حالاتی نیک" اور "حالاتی بدمعاش" کہنا چاہئے اور جو لوگ حالات کی وجہ سے کچھ نہیں بنتے ان کو بھی کچھ تو کہا جاسکتا ہے **مثلاً** "سیاست دان.....

حالات پر قابو پانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جو لوگ حالات پر قابو پالیتے ہیں۔ وہ بہت بہادر ہوتے ہیں اور جو لوگ حالات پر قابو نہیں پاسکتے وہ بھی بہادر ہوتے ہیں۔ کیونکہ جنہوں نے حالات پر قابو پایا ہوتا ہے انہوں نے کون سا تیر مارا ہوتا ہے ہم نے سنا ہے کہ انسان کا اپنے حالات سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ یعنی اگر حالات اچھے ہوں تو انسان اچھا ہوتا ہے اور اگر حالات برے ہوں تو انسان بھی برا ہوتا ہے۔ یہاں پر ایک نہایت دل چسپ صورت حال پیدا ہوتی ہے آپ ذرا سوچئیے کہ جب انسان جیسا بھی ہے اپنے حالات کی وجہ سے ہے تو اگر انسان کانا ہے تو پھر اس کے حالات بھی کانے ہونے چاہئیں۔ اس بات کو اگر مزید واضح کیا جائے تو حالات لنگڑے لولے، بہرے، اندھے، گونگے کئی طرح کی شکلیں اختیار کرسکتے ہیں۔

اس کے علاوہ کنجوس حالات، بخیل حالات، چست حالات، سست حالات، لالچی حالات، خود غرض حالات، مغرور حالات، چالاک حالات اور نالائق حالات بھی حالات کی اہم اقسام ہیں۔

حالات کا لفظ عام طور پر خطوط میں زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ **مثلاً** تحریر کنندہ لکھتا ہے میرے حالات ٹھیک ہیں۔ آپ کے حالات کیسے ہیں جواب لکھنے والا یہی لکھتا ہے میں خیریت سے ہوں یہ ایک لگا بندھا اصول ہے۔ چاہے کسی کی ماں کیوں نہ مرگئی ہو۔

حالات مثبت بھی ہوتے ہیں اور منفی بھی ..... جب یہ دونوں ایک دوسرے پر اثر کرتے ہیں تو باقی کچھ نہیں رہتا ..... یہ ایک سائنسی اصول ہے.....

حالات کا ایک دھارا بھی ہوتا ہے کہاں ہوتا ہے یہ ہمیں بھی نہیں معلوم! اسی طرح حالات کی چکی بھی ہوتی ہے یہ بھی ہم نے آج تک نہیں دیکھی۔ اکثر لوگوں کو حالات سے گلے شکوے ہوتے ہیں جو کہ وہ حالات سے نہیں کرتے بلکہ اپنے یار دوستوں سے کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر یہی گلے شکوے وہ حالات سے بھی کرتے تو پھر بھی کچھ نہیں ہوسکتا تھا ..... کیونکہ خدا نے حالات کو کوئی زندہ وجود تو دیا نہیں کہ اس کی گردن مروڑ دی جائے یا گلا دبا دیا جائے۔

آسمانی بجلی یا قہر خداوندی

اندھیری رات میں سیاہ بادلوں کے درمیان دوڑتی، چمکتی، آنکھوں کو خیرہ کرتی آسمانی بجلی جب زمین پر گرتی ہے تو دور دور تک ہر شے کو جھلسا کر رکھ دیتی ہے۔

قدیم زمانے میں لوگ آسمانی بجلی کو دیوتاؤں کا قہر سمجھتے تھے۔ لیکن سائنسی تجربات نے اس کی اصل حقیقت پر سے پردہ اٹھا دیا ہے۔

اب سے کوئی دو سو سال پہلے ماہر طبیعات بنجامن فرینکلن نے ایک خطرناک تجربے کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ آسمانی بجلی درحقیقت اسی بجلی کی ایک شکل ہے جو اونی کپڑے یا ریشم میں رگڑ سے پیدا ہوتی ہے یا ہمارے بالوں میں بعض اوقات کنگھی کرنے سے چٹ چٹاہٹ کی آواز پیدا کرتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہمارے روزمرہ تجربہ میں آنے والی بجلی کے مقابلے میں آسمانی بجلی ہزاروں، لاکھوں گنا زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔

آسمانی بجلی ہمیشہ کسی اونچی چیز پر گرتی ہے۔ مثلاً" میدان میں کسی اونچے درخت پر یا شہر میں کسی اونچی عمارت پر۔ بنجامن فرینکلن نے ۱۷۵۳ء میں لائٹننگ کنڈکٹر کو متعارف کرایا جس کی بدولت عمارتیں آسمانی بجلی گرنے پر بھی محفوظ رہتی ہیں۔ یہ حفاظتی آلہ محض ایک دھاتی سلاخ ہوتی ہے جسے عمارت کے بلند مقامات پر نصب کر دیا جاتا ہے اور یہ ایک تار کے ذریعے ارتھ کر دی جاتی ہے۔ اس طرح عمارت پر گرنے والی بجلی اس سلاخ کی نوک کے ذریعے بحفاظت زمین کے اندر اتر جاتی ہے۔

بجلیاں برستی ہیں کیسے آسمانوں سے

آتش فشاں پہاڑ کی آتش بازیوں کا جواب : آسمانی بجلی کے لہراتے مچلتے کڑاکے ۔

تیس ہزار درجے سینٹی گریڈ تک گرم جُھلسا کر راکھ کر دینے والے، ۳۲ کلومیٹر تک طویل آسمانی بجلی کے کڑاکے قہرِ الٰہی کی صورت میں زمین پر بار بار ضرب لگا سکتے ہیں ۔

رونگٹے ہی نہیں، اس سے آپ کے سر کے بال بھی کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ یہ ہے ایک تجرباتی گولے میں موجود برقی بار کا کمال ۔

محمد خالد

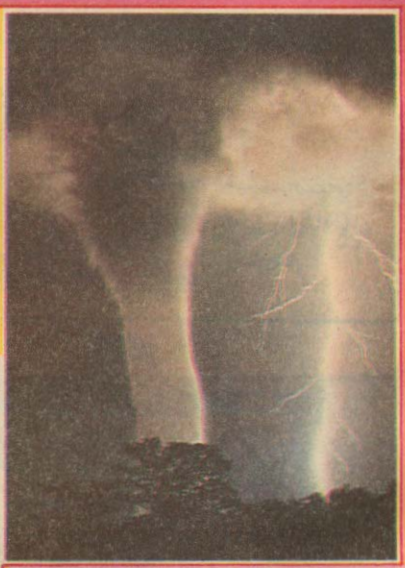

فلوریڈا کا ایک برقابی طوفان : جی ہاں ! کروڑوں گیلن پانی کا طوفانی دھارا اور اربوں جُول JOULE توانائی خارج کرتا ہوا برقی کڑاکا آسمان سے زمین پر برس رہا ہے ۔

آسمان میں کھیلتی، کلیلیں کرتی بجلی کے پنج شاخے ۔ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی آسمانی بجلی ایک سیکنڈ کے دس لاکھویں حصے میں اردگرد کی ہوا کو تیس ہزار درجے سینٹی گریڈ تک جُھلسا دیتی ہے ۔

اسے کہتے ہیں "ایک جان دو قالب"

غلام عباس جلبانی

ایسے بچے جنکے جسم آپس میں جڑے ہوتے ہوں بہت ہی نایاب ہوتے ہیں یعنی ۵۰ ہزار بچوں میں بہ مشکل ایک۔ ان میں اکثریت بچیوں کی ہوتی ہے۔ ایسے بچوں کو انگریزی میں سیامی بچے کہتے ہیں سیامی بچوں کو آپریشن کے ذریعے علیحدہ کردیا جاتا ہے چاہے اس کے نتیجے میں ان دونوں میں سے کوئی ایک مرہی کیوں نہ جائے یکسانہ کرنے کی صورت میں دونوں کے اکٹھے اور ٹھیک ٹھاک طریقے سے زندہ رہنے کے امکانات موجود رہتے ہیں۔

گزشتہ پانچ سات سالوں میں سات "سیامی بچوں" کے جوڑوں کو علیحدہ کرنے والے ایک ڈاکٹر نے بتایا کہ

"جڑواں بچوں کی دو ٹانگیں اور ایک جگر تھا۔ ان کو ۲۱ گھنٹوں کے طویل آپریشن کے بعد جدا کیا گیا جس کے بعد دونوں زندہ رہے۔ اگر ان کو جدا نہ کیا جاتا تو بھی وہ ۴۰ برس تک زندہ رہ سکتے تھے مگر اس صورت میں ان کا طرز زندگی بہت ہی زیادہ محدود ہو جاتا اور وہ کبھی بھی اپنے پیروں پر چلنے کے لائق نہ ہوتے۔"

گنگا اور جمنا، دو بہنیں۔ دوسر، چار بازو، دو ٹانگیں، آنتوں اور رفع حاجت کا نظام مشترک۔

جڑے ہوئے سر مگر دماغ اپنا اپنا، خیال اپنا اپنا۔

دو بھائی حسن اور حسین علیحدگی سے قبل ایک ہی تھے دونوں بھائیوں کی اموات میں وقفہ تین گھنٹے

Neither one egg nor two

The siamese twins Hassan and Hussein (above) were separated by a team of 25 doctors, nurses and technicians in 1987. Before the operation they were connected from the chest to the pelvis. Their livers had been joined and they had shared a common large bowel.

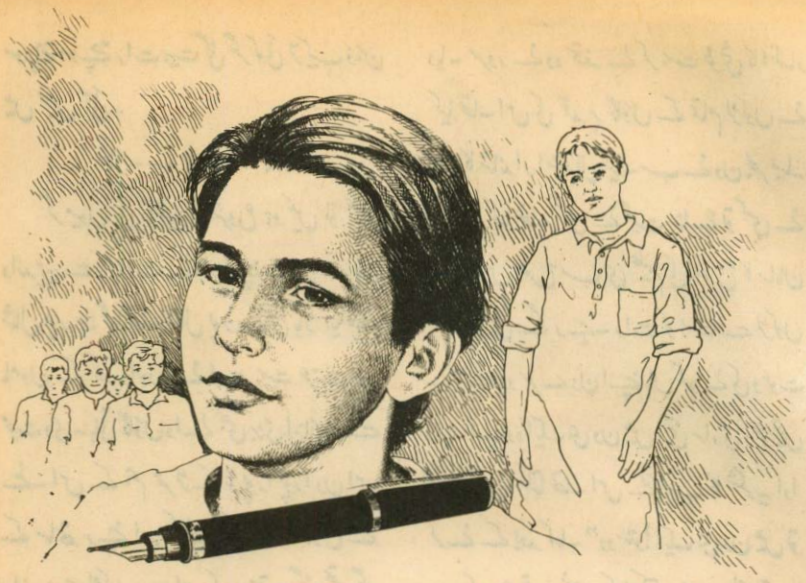

غصے پر غصہ

فاروق حسن چانڈیو

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ ہر طرف سناٹے کا راج تھا مگر علیم کے دماغ میں بہت شور تھا۔ شدید غصے کا شور۔ انتقام کے جذبے کا شور۔ وہ شور اسے سونے نہیں دے رہا تھا۔ اسے اپنی ذلت کا خیال سانپ بن کر ڈس رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اسی وقت جائے اور سرور کو مار مار کر لہولہان کردے۔ مگر اس وقت ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ نہ تو اس کے پاس اسلحہ تھا نہ ہی کسی سے لڑائی میں مدد ملنے کی امید تھی۔ وہ اس وقت اپنے گاؤں سے بیس میل دور شال پور گاؤں میں ماموں کے گھر میں تھا۔ ماموں سے لڑائی جھگڑے کی تو بات ہی نہیں کرسکتا تھا۔ ماموں کا کوئی بیٹا بھی نہیں تھا جس سے مدد مانگتا۔ وہاں اس کا سب سے گہرا دوست سرور تھا۔ اور وہی اس کا دشمن بن گیا تھا۔ اسے فوری طور پر انتقام لینے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔

سوچتے سوچتے رات بیت گئی مگر کوئی ترکیب ذہن میں نہیں آئی۔

☆---☆---☆

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوئیں تو علیم والدین سے اجازت لے کر اپنے ماموں کے ہاں شال پور چلا گیا تھا۔ شال پور وہ پہلی بار آیا تھا۔ ماموں کے گھر والوں نے اسے بہت عزت اور محبت دی۔ باقی گاؤں والے بھی بڑی اپنائیت سے ملے۔ اس کے ہم عمر لڑکے تو پورا پورا دن اس کے ساتھ رہنے اور کھیلنے لگے تھے۔ گاؤں کے سارے ہی لڑکوں سے اس کی دوستی ہوگئی تھی مگر اس کی سب سے گہری دوستی سرور سے تھی۔ سرور اس کا پکا دوست بن گیا تھا۔ علیم نے دس دن وہاں گزارے مگر اسے لگ رہا تھا کہ جیسے دو تین دن ہی گزرے ہوں۔ گاؤں سے لوٹتے وقت تمام لڑکوں نے خاص طور پر سرور نے بہت اصرار کیا تھا کہ آئندہ وہ سال کی پوری گرمیوں کی چھٹیاں وہاں آکر گزارے۔ ان کے اصرار اور اپنی دلی خواہش پر اس نے فوراً" حامی بھرلی تھی اور اب کے وہ پورے دو ماہ کے لئے والدین سے اجازت لے کر شال پور آگیا تھا۔

اس نے شال پور پہنچ کر اپنے گہرے دوست سرور کو ایک بہت خوبصورت قلم کا تحفہ دیا۔ سرور نے وہ تحفہ لے کر بہت خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اس کی آمد پر گاؤں کے تمام لڑکوں نے اس کا شاندار استقبال کیا۔ سب نے دن بھر میلہ لگائے رکھا تھا۔ کسی نے گیت سنائے تو کسی نے لطیفے۔ اس طرح سب ہی علیم کی تفریح کا سامان کرنے میں لگے رہے۔ رات کو بہت سے لڑکوں نے اسے دوسرے دن اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی۔ اب وہ ایک ہی دن میں اتنی ساری دعوتیں تو کھا نہیں سکتا تھا۔ اس لئے سب کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا۔ "دوستو! ایک ہی دن میں تو سب کی دعوتیں نہیں کھاسکتا۔ اس لئے آپ سب طے کرلیں کہ میں کس دن کس کی دعوت میں شرکت کروں؟"

سب لڑکوں نے باہمی مشورے سے دعوت کے دن تقسیم کرلیے۔ اس طرح دوسرے دن سے دعوتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ دعوت میں علیم ہی کو نہیں تمام لڑکوں کو بلایا جانے لگا تاکہ صرف کھانا ہی نہیں ہنسی مذاق کا لطف بھی ساتھ رہے۔ علیم اپنی اس عزت افزائی پر بہت خوش تھا۔ اسے پچھلے سال سے بھی زیادہ مزا آنے لگا تھا۔ پچھلے سال صرف محفلیں ہی جمتی رہی تھیں کوئی دعوت نہیں ہوئی تھی۔ ان پرلطف دعوتوں میں پانچ دن تو بہت ہی مزے سے گزرے

مگر چھٹے دن نے علیم کو ہلا کر رکھ دیا۔ تمام مزے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ہوا یہ کہ شام کا وقت تھا اور ہنسی مذاق کا دور چل رہا تھا۔ علیم محفل کا ہیرو بنا بیٹھا تھا۔ وہ بار بار لڑکوں کی پُر مزاح باتوں پر قہقہے لگا رہا تھا۔ اسی وقت تنویر نامی ایک لڑکے نے سرور سے کہا۔ "بتا یار یہ قلم جو تیری جیب پر لگا ہے کہیں سے چرایا ہے کیا.....؟ پہلے تو تیرے پاس کبھی نہیں دیکھا۔"

"ہنہ..... بڑے بھولے ہو یار..... اول تو چوری جیسی گھٹیا حرکت میں کر نہیں سکتا۔ خدانخواستہ غلطی کر بھی بیٹھتا تو ایسا گھٹیا' عام سا قلم نہ چراتا۔" سرور نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔

وہ قلم علیم نے سرور کو تحفے میں دیا تھا۔ سرور کے منہ سے اس قلم کے بارے میں گھٹیا اور عام جیسے القاب سن کر اسے بہت دکھ پہنچا مگر مذاق سمجھ کر برداشت کر گیا۔ بات وہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ ایک اور لڑکے شمس نے کہا۔ "اگر چوری نہیں کی تو پھر خریدا ہی ہو گا گھٹیا قلم۔"

"نا..... نا بابا نا..... میں ایسا گھٹیا قلم خریدنا تو دور کی بات ہے۔ اپنی جیب میں رکھنا بھی اپنی توہین سمجھ رہا ہوں مگر کیا کروں مجبوری ہے..... اس قلم کو برداشت کرنا ہے۔" سرور نے پھر سے منہ ٹیڑھا کرتے ہوئے کہا۔

"بتا تو..... ایسی بھی کیا مجبوری ہے.....؟" شمس نے مسکرا کر پوچھا۔

"یہ عذاب میرے گلے میں اپنے دوست علیم نے ڈالا ہے..... اس نے تحفہ دیا ہے..... بے چارہ کوئی اچھا سا قلم تو دے نہیں سکتا تھا۔ اس کے پاس اتنے پیسے ہی نہیں ہوں گے.....؟" سرور نے علیم کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

اب علیم سے برداشت نہیں ہو سکا اور اس نے بھڑک کر کہا۔ "میری مالی حالت تم سے بہت اچھی ہے..... معمولی کلرک کے بیٹے..... میرے ابو اچھے خاصے زمیندار ہیں..... اور تم جس قلم کو گھٹیا اور عام سا کہہ رہے ہو وہ پورے سو روپے کا قیمتی قلم ہے۔ ایسا قلم تو تم نے زندگی میں نہیں خریدا ہو گا..... تمہارے کلرک والد تو تم کو دفتر کے بال پین ہی لا کر دیتے ہوں گے.....!"

"دیکھو..... دیکھو علیم..... بات تمہاری اور ہماری ہو رہی ہے..... تم میرے ابو جان کا نام لے کر بہت زیادتی کر رہے ہو..... یہ زیادتی اب مجھ سے مزید برداشت نہیں ہو گی۔" سرور نے بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اور تم نے جو میری بے عزتی کی ہے..... میرے خلوص کا مذاق اڑایا ہے.....

میرے دیئے ہوئے تحفے کو گھٹیا کہا ہے یہ زیادتی نہیں تھی ..... میں ..... تم سے اس بے عزتی کا انتقام ضرور لوں گا ....." علیم نے شدید غصے کے عالم میں کہا اور وہاں سے چل پڑا غصے اور غم کی شدت سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ وہ سیدھا اپنے ماموں کے گھر آگیا تھا اور چھت پر جاکر اکیلا بیٹھ گیا تھا۔ غصے کی وجہ سے سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ بس بے سبب وہاں بیٹھا الٹی سیدھی باتیں سوچے جارہا تھا۔ کبھی سوچتا کہ اسی وقت اپنے گاؤں واپس چلا جائے۔ کبھی خیال آتا کہ ماموں کے گھر سے چھری اٹھا کر سرور کو جاکر مار دے۔ اسی طرح کی سوچوں میں رات ہوگئی۔ گھر والوں نے کھانے کے لئے اسے نیچے بلایا تو وہ نیچے اترا۔ مگر کھانا اسے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ چند نوالے زہر مار کرنے کے بعد اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ ماموں نے پوچھا کہ "کھانا کم کیوں کھایا؟" اس پر اس نے بہانا بنایا کہ "دوپہر کو زیادہ کھالیا تھا۔" وہ ماموں کو اصل بات بتانا نہیں چاہتا تھا۔ کھاتے ہی وہ بستر پر جاکر لیٹ گیا۔ مگر نیند کی بجائے انتقام کے جذبے نے اسے گھیرے رکھا۔ وہ رات بھر بے چینی سے انتقام لینے کی ترکیبیں سوچتا رہا مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ بس غصے میں جلتا رہا سرور کی بے وفائی کے دکھ سے کبھی کبھی اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آتے رہے۔

نماز فجر کی اذان سن کر وہ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ وہ نمازِ فجر باقاعدگی سے پڑھنے کا عادی تھا۔ مسجد پہنچا تو وہاں سرور سے سامنا ہوگیا۔ اس نے سرور کو دیکھ کر منہ پھیرلیا۔ یہاں تک کہ سرور کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔ نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکلا تو وہ کافی حد تک پرسکون تھا۔ اس کا غم اور غصہ کم ہوچکا تھا البتہ گھر پہنچنے تک اس نے اپنے گاؤں واپس جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ناشتے کے دوران اس نے اپنے ماموں سے اپنے ارادے کا اظہار کیا۔ ماموں بہت حیران ہوئے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ علیم پورے دو مہینے وہاں گزارنے آیا ہے انہوں نے علیم سے کہا۔ "کیوں بیٹے! تم تو دو مہینے کے لئے آئے تھے۔ پھر اس قدر جلد واپسی کا کیوں سوچ رہے ہو .....؟"

"بس .... وہ ..... یوں ہی ....." علیم نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔ دراصل وہ ماموں کو اصل وجہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔

"خیر..... چلے جانا ..... مگر بیٹے کم سے کم دو ہفتے تو رہو ..... اتنی جلدی واپس جاؤ گے تو تمہارے ماں باپ سوچیں گے کہ ہم نے شاید تم

کو عزت اور محبت نہیں دی۔"

ماموں کی بات معقول تھی۔ اس لئے علیم کوئی بہانہ نہیں بنا سکا اور مزید کچھ دن رہنے کی حامی بھرلی۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ سارا سارا دن گھر میں فارغ بیٹھ کر کیا کرے گا۔ وہ گاؤں کے لڑکوں سے ناراض تھا۔ ان کے ساتھ ہنسنا کھیلنا اور بولنا نہیں چاہتا تھا۔ اچانک اس کی نظر دیوار پر لٹکی ہوئی بندوق پر پڑی اور فوراً" وقت گزارنے کی ترکیب اس کے ذہن میں آگئی۔ اس نے سوچا کہ شکار کیا جائے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے ماموں سے کہا۔ "ماموں جان میں جنگل میں جاکر شکار کرنا چاہتا ہوں۔"

"شوق سے بیٹے ..... مجھے بھی شکار کا بہت شوق ہے۔ افسوس یہ کہ میں اس وقت تمہارے ساتھ نہیں جاسکتا۔" ماموں نے کہا۔ "بس سانپوں سے ہوشیار رہنا۔"

جنگل گاؤں کے قریب ہی تھا۔ کچھ ہی دیر میں علیم وہاں پہنچ گیا اور وہ درختوں کی شاخوں پر نظریں دوڑاتا ہوا بڑھتا چلا جارہا تھا۔ درخت گھنے تھے اس لئے دور سے کوئی پرندہ نظر نہیں آتا تھا اور قریب جانے پر پرندے اڑ جاتے تھے۔ علیم نے سوچا کہ جھاڑیوں میں چھپ چھپ کر دبے قدموں چلنا چاہئے۔ ایک جھاڑی سے اچانک "سررر ....." کی آواز سن کر وہ اچھل پڑا اور محتاط نگاہوں سے اس طرف دیکھنے لگا کہ کہیں کوئی سانپ نہ ہو۔ وہ جھاڑی خاصی بڑی تھی مگر گھنی نہیں تھی۔ شاخوں کے درمیانی خلا سے دوسری طرف نظر جارہی تھی۔ علیم کو جھاڑی کے دوسری طرف تقریباً" سو قدم کے فاصلے پر ایک لڑکا زمین پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ وہ لڑکا زمین پر پھیلے ہوئے خشک پتوں کو ہاتھوں سے الٹ پلٹ کر کچھ تلاش کررہا تھا۔ لڑکے کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ایسے رُخ سے بیٹھا تھا کہ علیم کو اس کا چہرہ نہیں نظر آرہا تھا۔ مگر اس کے ڈیل ڈول کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ کوئی جانا پہچانا لڑکا ہے۔ "ہوگا کوئی ..... میرا کیا ....." علیم نے دھیمی آواز میں بڑبڑا کر شکار کی طرف جانا چاہا۔ اسی وقت زمین پر بیٹھے ہوئے لڑکے نے اپنا رخ بدلا اور علیم نے اسے پہچان لیا۔ وہ سرور تھا۔ اسے پہچان کر علیم کے ذہن میں انتقامی جذبہ ایک دفعہ پھر پورے زور سے اٹھا۔ اس نے سوچا کہ سرور سے اپنی ذلّت کا بدلہ لینے کا یہ بہترین موقع ہے۔ چھپ کر اچانک اس پر حملہ کیا جائے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے نظریں گھما کر کسی بھاری لکڑی کو تلاش کرنا شروع کیا تاکہ اسے لاٹھی کے طور پر استعمال کرسکے۔ کچھ

دور اسے ایسی ایک لکڑی نظر آگئی۔ علیم نے اسے اٹھالیا اور دبے قدموں جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا سرور کی طرف بڑھنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں وہ اس کے قریب والی جھاڑی کے پاس پہنچ گیا۔ اچانک کسی کے سلام کرنے کی آواز سن کر وہ رک گیا۔ اس نے شاخوں کے درمیان سے اس طرف دیکھا۔ وہ اسماعیل تھا۔اسماعیل اسی گاؤں کا تھا اور اس وقت موجود تھا جب علیم اور سرور کے درمیان تلخ کلامی ہوئی تھی۔ اب علیم انتظار کرنے لگا کہ وہ لڑکا ٹل جائے۔کیونکہ اسے ڈر تھا کہ وہ سرور کا طرف دار بن کر اس سے لڑسکتا ہے۔

"اور بھئی سرور ..... کیا ہو رہا ہے .....؟ کیا تلاش کر رہے ہو ....؟" اسماعیل نے سرور سے پوچھا۔

"یار یہاں سے جلانے کی لکڑیاں لینے آیا تھا..... قلم گر گیا ہے اسے تلاش کر رہا ہوں۔"

"اتنا قیمتی قلم تھا کیا؟" اسماعیل نے پوچھا۔

"ہاں یار بہت قیمتی، بہت خوبصورت..... اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ قلم مجھے پیارے دوست علیم نے تحفے میں دیا تھا۔"

"تو کیا ..... !!! کل وہ سب کچھ کیا تھا .....!؟" اسماعیل نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ سب کچھ ..... وہ ..... چھوڑو یار ..... وہ ایک راز ہے ..... جس میں صرف چار افراد شریک ہیں ..... کسی اور کو شریک نہیں کرنا چاہتا۔" سرور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہاری مرضی ..... میں تو یونہی پوچھ رہا تھا۔ کہو تو میں بھی قلم تلاش کروں؟"

"یار! پھر تو تیری بڑی مہربانی ہوگی کیونکہ یہاں سانپوں کا خوف بھی ہے۔" سرور نے خوش ہو کر کہا۔ تھوڑی دیر بعد اسماعیل نے کہا۔ "سرور قلم تو مجھے نظر آگیا ہے۔ مگر تم کو دکھاؤں گا اس وقت جب تم وہ راز مجھے بھی بتاؤ گے۔"

سرور نے بہت منتیں کیں کہ وہ بغیر راز جانے قلم اس کے حوالے کردے مگر اسماعیل ضد پر اڑا رہا۔ جھاڑی کی آڑ میں علیم بھی بیٹھا وہ سب کچھ سن اور دیکھ رہا تھا۔ وہ سرور کی باتیں سن کر اپنے رویے پر شرمندہ تھا اور سرور کے کل کے رویے پر حیران بھی تھا۔ اس نے سوچا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ اسماعیل وہ راز سنے بغیر قلم کی نشان دہی نہ کرے تاکہ وہ بھی راز جان جائے۔

سرور کو یقین ہوگیا کہ اسماعیل راز جانے بغیر قلم کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔دھوپ چڑھ رہی تھی، سانپوں کا خوف الگ تھا۔ چنانچہ

اس نے پہلے تو اسماعیل سے وعدہ لیا کہ وہ راز کسی کو نہیں بتائے گا۔ اس کے بعد اس نے راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "علیم بہت ہی مخلص اور اچھا لڑکا ہے مگر اس میں ایک ایسی عادت ہے جس کی وجہ سے پر خلوص دوستوں کی دل آزاری ہو رہی تھی۔ وہ یہ کہ سرور جس دوست کے ہاں بھی دعوت پر جاتا تھا اس کے کھانوں میں کوئی نہ کوئی عیب ضرور نکالتا تھا۔ کہیں کہتا کہ سالن میں نمک زیادہ ہے، کہیں کہہ دیتا کہ مرچ زیادہ ہے۔ کہیں بولتا کہ روٹیاں موٹی اور بے مزہ ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس کے ان تبصروں پر میزبان دوست کے خلوص کو ٹھیس لگتی تھی۔ چنانچہ میرے تین دوستوں نے مشورہ کرکے کل والا ڈرامہ کیا تھا تاکہ علیم کو احساس ہو کہ کسی پر خلوص دوست کا کھانا ہو یا کوئی تحفہ ہو اس کی برائی کی جائے تو کتنا دکھ ہوتا ہے۔ یہی راز تھا۔ آج ہم سب دوست اس کے پاس جاکر معافی مانگیں گے اور کہہ دیں گے کہ کل ہم نے اس سے مذاق کیا تھا۔ اس طرح تعلقات بھی معمول پر آجائیں گے اور ہمارا مقصد بھی حل ہو جائے گا۔

اسماعیل اس کے خلوص اور منصوبے دونوں پر بہت حیران تھا۔ اس نے قریب ہی سے پتے ہٹا کر قلم نکالا اور سرور کے حوالے کردیا۔ ادھر علیم سرور کی باتیں سن کر شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ اسے اپنے ناجائز غصے پر سخت غصہ آرہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اسی ڈنڈے سے خود کو مارنا شروع کردے جو اس نے سرور کو مارنے کے لئے اٹھایا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ڈنڈا پھینکا اور جھاڑی کی آڑ سے نکل کر سرور کو گلے لگا لیا۔ سرور اسے اچانک سامنے دیکھ کر حیران ہوا لیکن اگلے ہی لمحہ اس نے علیم کو زور سے لپٹا لیا۔ اسماعیل ان کی اس دوستی پر مسکرا رہا تھا جو اب مزید مضبوط ہونے والی تھی۔

"پھل دار درخت"

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا "بیٹے! ایمان کے بعد سب سے پہلے ایک مخلص اور دانا دوست تلاش کرو۔ ایسا دوست ایک پھل دار درخت کی مانند ہے اسکے نیچے بیٹھو گے تو سایہ دے گا اور اوپر چڑھو گے تو پھل ملیں گے۔"

مرسلہ: سیدہ فرحانہ ظفر، تھال، کراچی

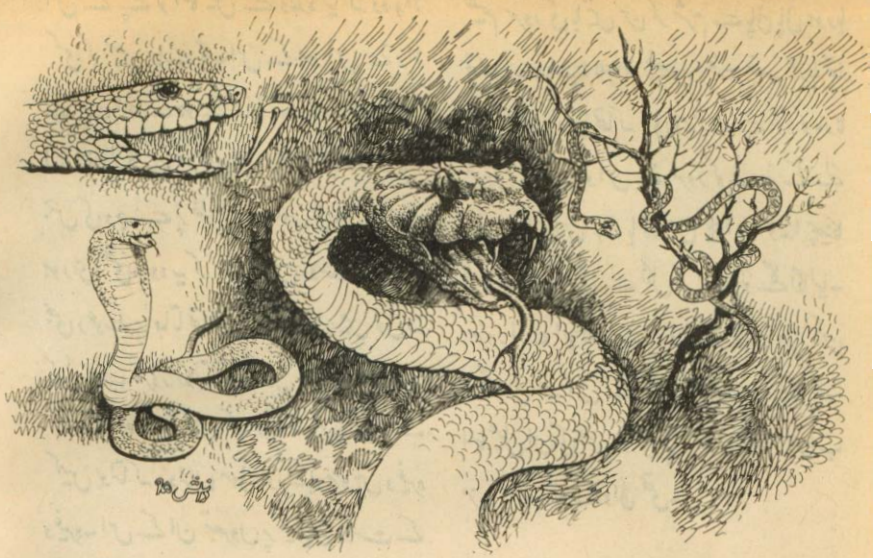

سانپوں کے بارے میں

نگہت آراء چوہان

سانپ۔ یہ چار حرفی لفظ خوف و دہشت کی علامت ہے۔ بچے تو بچے بڑے بھی سانپ سے خوف کھاتے ہیں۔ آیئے آپ کو سانپوں کے بارے میں کچھ معلومات بہم پہنچائیں۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ آج کل تقریباً دو ہزار چار سو اقسام کے سانپ کرۂ ارض پر پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے صرف آٹھ فیصد زہریلے ہوتے ہیں جو اپنے شکار کو زہر کے ذریعے مار دیتے ہیں یا بے ہوش کر دیتے ہیں۔ بہت سے زہریلے سانپوں میں زہر اتنا زیادہ طاقتور یا مقدار میں زیادہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ انسان کو نقصان پہنچا سکیں۔

تمام سانپ بہت زیادہ مقدار میں لعاب دہن پیدا کرتے ہیں جس کی مدد سے وہ اپنے شکار کو نگل کر ہضم کر لیتے ہیں۔ زہریلے سانپوں میں ایک غدود ایسا مادہ پیدا کرتا ہے جو سانپ کے شکار کے لئے زہریلا ہوتا ہے یہی مادہ سانپ کا زہر کہلاتا

ہے۔ بعض سانپوں میں اتنا طاقتور زہر ہوتا ہے جس سے ایک ہاتھی بھی مر سکتا ہے۔ دوسروں میں اتنا کم ہوتا ہے جس سے صرف ایک چھوٹی سی چھپکلی مر سکتی ہے۔ غالباً زہریلے سانپوں کی دو سو اقسام کو انسان کے لئے خطرناک خیال کیا جاتا ہے۔

زہریلے سانپوں میں کوبرا اور اس کے رشتہ دار ایک خاندان خیال کئے جاتے ہیں۔ دوسری قسم میں ایک چھوٹی نسل کا نہایت زہریلا سانپ ہوتا ہے۔ جس کو "کوڑیا" کہتے ہیں کیونکہ اس کی جلد پر کوڑی کی شکل کے نشانات بنے ہوتے ہیں۔ سانپوں کے سب سے بڑے خاندان کو "کولوبرائڈ" کہتے ہیں ان میں بھی بعض سانپ زہریلے ہوتے ہیں۔

کوبرا اور ان کے رشتہ دار سانپوں کے منہ میں اوپر کے جبڑے میں دونوں طرف ایک بڑا دانت ہوتا ہے۔ یہ بڑے دانت سوراخ دار ہوتے ہیں لیکن اکثر کوبرا نسل کے سانپوں کے بڑے دانت ڈھکے ہوتے ہیں جو ایک خالی ٹیوب کی مانند ہوتے ہیں۔ زہریلے غدود کے ارد گرد ایک پٹھا ہوتا ہے جس وقت سانپ کاٹتا ہے تو پٹھا غدود پر دباؤ ڈالتا ہے جس کی وجہ سے زہر غدود سے نکل کر بڑے دانت کی نالی میں آجاتا ہے اور پھر اس نوکیلے دانت سے نکل کر شکار کے جسم میں داخل ہوتا ہے۔

ایک تھوکنے والا کوبرا بھی ہوتا ہے جو اپنے سوراخ دار دانت سے زہر نکال کر تھوک سکتا ہے۔ اس کوبرا کا نشانہ اس جانور کی آنکھیں ہوتی ہیں جس سے اس کو خطرہ لاحق ہوتا ہے جیسے کہ بارہ سنگھا یا جنگلی بھینسا۔ اس سانپ کے منہ سے اڑنے والا زہر دو میٹر کی بلندی تک جاتا ہے اور فوراً اندھا کر دیتا ہے۔ کوبرا کا زہر بالعموم شکار کے اعصابی نظام کو مفلوج کر دیتا ہے اور وہ حرکت نہیں کر سکتا۔ جب زہر اعصابی نظام کے اس مرکز میں پہنچتا ہے جو سانس لینے کے عمل یا دل کی دھڑکن کو کنٹرول کرتا ہے تو اس کا شکار مر جاتا ہے۔ وائیر یا کوڑیا نسل کے سانپوں کے زہریلے دانت بڑے لمبے ہوتے ہیں۔ ان کے زہر کا اثر خاص طور پر شکار کے خون کے خلیات یا خون کی نالیوں پر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے بہت بڑے حصے میں سوجن پیدا ہو جاتی ہے اور زخم سے خون جاری ہو جاتا ہے۔

سانپ کیا کھاتے ہیں؟ سبزی ترکاری کھانے والا کوئی سانپ نہیں ہوتا۔ یہ تمام گوشت خور ہوتے ہیں اور کسی نہ کسی قسم کے جانور کو کھاتے ہیں۔ سانپوں میں نہایت طاقتور عرقیات ہوتے ہیں اور کیونکہ سانپ اپنے شکار کو سالم نگل لیتے اس لئے ان کو ایسے عرقیات کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ بلیوں کی طرح ان کے دانت نہیں ہوتے جن سے یہ اپنا شکار کاٹ کر کھا سکیں چڑیوں اور جنگلی فاختاؤں کی تیز چونچیں ہوتی ہیں۔ سانپوں کے تو صرف سوئی کی طرح سیدھے سیدھے دانت ہوتے ہیں جن سے یہ اپنے شکار کو پکڑ کر اپنے منہ کے اندر کی طرف کھینچ لیتے ہیں لیکن یہ اس کو چبا نہیں سکتے ہیں۔

سانپوں اور ان کے کھانے کے بارے میں ایک نہایت غیر معمولی چیز ان کے جبڑوں کی ساخت

ہے۔ ان کے جبڑے کھوپڑی کی ہڈیوں سے نہایت ڈھیلے طریقے پر جڑے ہوتے ہیں۔ ان کے کناروں پر دانت ہوتے ہیں اور اکثر سانپوں کے اوپری جبڑے میں دانتوں کی دو قطاریں ہوتی ہیں۔ دانتوں کی یہ دونوں قطاریں ہڈیوں میں ہوتی ہیں جن کو خصوصی پٹھے حرکت دیتے ہیں۔

اپنے شکار کو کھاتے وقت سانپ ایک جبڑے سے اپنی غذا اندر کی طرف دھکیلتا ہے جبکہ باقی جبڑے کے دانت شکار کو پکڑے رکھتے ہیں۔ اس کے بعد دوسری جبڑے کی ہڈی شکار کو اندر کی طرف کھینچتی ہے اور اس طریقے سے غذا سانپ کے حلق میں اتر جاتی ہے۔ جبڑوں کی ترتیب کی وجہ سے ایک سانپ حیرت انگیز حد تک بڑے جانوروں کو کھا جاتا ہے۔ مثلاً اژدھے۔ بعض اوقات یہ ہرن اور چیتے کے برابر جانوروں کو نگل جاتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ چھوٹے سانپ کیڑے مکوڑے کھاتے ہیں۔ زیادہ تر سانپ متوسط جسامت کے جانور کھاتے ہیں جیسے کہ جھینگر، مینڈک، مچھلی، چوہیا، چوہے اور پرندے۔ کچھ چھوٹے اور اندھے سانپ صرف دیمک کھاتے ہیں اور کچھ ایسے بھی سانپ پائے جاتے ہیں جو دوسرے سانپوں کو کھا جاتے ہیں۔سانپ صرف اپنی مخصوص غذا کھانے میں بڑا تکلف کرتے ہیں۔ سبز رنگ کا سانپ مکڑیاں، مچھلیاں، پرندے اور گنڈاریں کھاتا ہے۔ پانی کا سانپ مچھلیاں اور مینڈک کھاتا ہے لیکن کیڑے مکوڑے اور چوہے نہیں کھاتا ہے۔ گارٹر نسل کا سانپ بہرحال مختلف قسم کے جانور کھا جاتا ہے جن میں کیڑے مکوڑے اور مچھلیاں، مینڈک، چوہے اور پرندے شامل ہیں۔

"بہتر کون؟"

ایک دفعہ پھولوں اور کانٹوں کی آپس میں نوک جھونک ہوگئی۔ کانٹے پھولوں سے کہنے لگے کہ ہم تم سے بہتر ہیں ہم تمہاری طرح ذرا سے دباؤ سے ٹوٹتے نہیں۔

پھولوں نے کہا کہ ہم تمہاری طرح کسی کو چبھتے نہیں اس لئے ہم تم سے بہتر ہیں۔ان کی نوک جھونک ہو رہی تھی کہ ایک تتلی وہاں آگئی۔ تتلی نے جب ان کی باتیں سنیں تو کہا "میں تمہیں بتاتی ہوں کہ کون بہتر ہے" پھر اس نے کانٹوں سے کہا.....

"تم انسان کو دکھ دیتے ہو، مگر پھول اسے سکھ دیتے ہیں۔ اس لئے پھول تم سے بہتر ہیں۔" یہ سن کر ایک ذہین کانٹا فوراً بولا.....

"بے شک پھول ہم سے بہتر ہیں، لیکن انسان سے بہتر ہم ہیں" تتلی نے حیران ہو کر پوچھا، وہ کیسے؟ ذہین کانٹے نے جواب دیا "وہ ایسے کہ ہم انسانوں کی طرح ایک دوسرے کے قریب ہی رہتے ہیں لیکن ان کی طرح ایک دوسرے کو چبھتے نہیں۔

کاش کہ ہم سب بھالو ہوتے

محسن علی

وادی وادی گھومنے جاتے
مٹک مٹک کر قدم اٹھاتے
جنگل جنگل ناچتے گاتے
جی بھر کے ہم شور مچاتے

منہ میں ہمارے آلو ہوتے
کاش! کہ ہم سب بھالو ہوتے

گھاس پہ اپنے بستر ہوتے
دیر سے اٹھتے، جلدی سوتے
سونے میں وقت اپنا کھوتے
اٹھتے بھی تو منہ نہ دھوتے

بھنوؤں جیسے تالو ہوتے
کاش! کہ ہم سب بھالو ہوتے

آخر اک دن ایسا آتا
ہم کو مداری اک لے جاتا
کرتب خوب ہمیں سکھلاتا
بازاروں میں ہمیں نچاتا

ہم شیطان کے خالو ہوتے
کاش کہ ہم سب بھالو ہوتے

سیّد مسعود حسن رضوی ادیب

پانی کا سفر

تم نے برسات کے دنوں میں اکثر پانی برستے اور ندی نالے بہتے ہوئے دیکھے ہوں گے۔ مگر کبھی یہ بھی سوچا کہ آخر یہ پانی آتا کہاں سے اور جاتا کہاں ہے؟ اگر تم نے خود اس بات پر غور نہ کیا ہو تو مجھ سے سنو۔

جتنا پانی برستا ہے اس میں سے کچھ تو ہوا اڑا لے جاتی ہے، کچھ زمین میں جذب ہو جاتا ہے، اور بہت سا چھوٹی چھوٹی نالیوں میں ہو کر بہہ نکلتا ہے۔ پھر کئی کئی نالیاں مل کر بڑے بڑے نالے بن جاتے ہیں۔ یہ نالے آگے بڑھ کر کسی ندی میں گرتے ہیں۔ ندیاں بھی کچھ دور چل کر کسی دریا میں مل جاتی ہیں۔ پھر کئی چھوٹے چھوٹے دریا مل کر بڑے بڑے زبردست دریا بن جاتے ہیں۔ یہ دریا سیکڑوں ہزاروں میل بہتے چلے جاتے ہیں اور آخر کار سمندر میں جا گرتے ہیں۔

سمندر میں پہنچ کر بھی یہ پانی نچلا نہیں بیٹھتا۔

آفتاب کی گرمی سے رفتہ رفتہ بخارات یعنی بھاپ کی شکل اختیار کر کے ہوا میں مل جاتا ہے۔ ہوا کا خاصہ ہے کہ جب اس میں گرمی پہنچتی ہے تو وہ اوپر کو چڑھتی ہے۔ اس لئے جب سمندر کے اوپر کی ہوا گرم ہو کر آسمان کا رخ کرتی ہے تو اپنے ساتھ بخارات کو بھی اڑا لے جاتی ہے۔

زمین میں جتنا بلند ہوتے جاؤ اتنی ہی سردی بڑھتی جاتی ہے۔ اور بخارات کا خاصہ یہ ہے کہ ادھر ان میں سردی پہنچی اور ادھر وہ پانی ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب ہوا بہت بلندی پر پہنچتی ہے تو یہی بخارات سردی پا کر ننھی ننھی بوندیں بن جاتے ہیں جو ہوا پر تھمی رہتی ہیں۔ یہ بادل جو آسمان پر چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں اصل میں یہی چھوٹی چھوٹی بے شمار بوندیں ہیں جنہیں ہوا ادھر ادھر اڑائے لئے پھرتی ہے۔ جب ہوا میں بہت سے بخارات جمع ہو جاتے ہیں تو بادل دور سے کالے کالے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

یہاں سے تو بادل آسمان کو چھوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں مگر کسی پہاڑ پر چڑھ کر دیکھو تو وہ بالکل سروں پر سے گزرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ اتنے قریب کہ چاہو تو ہاتھ بڑھا کر چھو لو۔ مگر وہاں ہے کیا جو تمہارے ہاتھ میں آجائے۔ ہاں کبھی کبھی نمی سی ضرور معلوم ہو گی۔ بارش کے زمانے میں بادل بالکل پہاڑ کو چھوتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ جو لوگ گرمیوں میں ہوا خوری کے لئے نینی تال، منصوری یا شملہ جاتے ہیں انہیں اکثر بادلوں میں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں بادلوں کے اس پار کی کوئی چیز نہیں دکھائی دیتی اور کپڑے کچھ کچھ نم ہو جاتے ہیں۔

جب ہوا اور اوپر چڑھ جاتی ہے اور سردی زیادہ بڑھ جاتی ہے، یا جب کسی اور وجہ سے ہوا میں بہت ٹھنڈک پہنچ جاتی ہے تو یہ چھوٹی چھوٹی بوندیں مل کر بڑے بڑے قطرے بن جاتے ہیں۔ ہوا ان قطروں کا بوجھ سنبھال نہیں سکتی اور وہ زمین پر گرنے لگتے ہیں اسی کو ہم پانی برسنا کہتے ہیں۔

ادھر پانی آسمان سے زمین پر آیا کہ پھر نالیوں، نالوں، ندیوں اور دریاؤں میں ہوتا ہوا سمندر میں جا پہنچا۔ پھر سمندر سے اٹھا، آسمان پر پہنچا، وہاں نہ معلوم کہاں کہاں پھرا کیا۔ آسمان سے زمین پر آیا۔ اور ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے پھر سمندر میں جا پہنچا۔ اس طرح پانی ہمیشہ سفر کیا کرتا ہے اور اس کا ایک ایک دورہ لاکھوں میل کا ہوتا ہے۔

"مٹی سے غسل"

جی ہاں "ارجن ٹیریا" یونان کا ایک جزیرہ ہے۔ جہاں لوگ صابن کی بجائے مٹی سے نہاتے ہیں۔ کیونکہ یہاں کی مٹی میں قدرتی طور پر صابن پایا جاتا ہے۔

(مرسلہ..... قیصر محمود عباسی..... ماسرہ)

ایک سوال دس جواب

مرسلہ : محمد شعیب طاہر

ایک جگہ دس افراد خاموش بیٹھے تھے۔ بالکل چپ، اپنی اپنی سوچوں میں گم۔ کہیں سے ایک ہمکتا ہوا بچہ آنکلا۔ اسے دیکھتے ہی سب کے چہروں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی اور کچھ ہی دیر میں وہاں ان سب کے قہقہے گونجنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد بچہ وہاں سے رخصت ہوگیا مگر اپنی رونقیں وہیں چھوڑ گیا۔ "بچے بھی کیا چیز ہیں؟" ان میں سے ایک نے کہا۔ اس ایک سوال پہ دس جواب آئے کیونکہ وہاں دس افراد تھے۔ مگر کیا واقعی جواب تعداد میں دس ہیں؟ یا یہ ایک ہی گیت ہے جو دس سازوں پر گایا جارہا ہے۔

منصور نے کہا : "بچے ایک ایسی تصویر کی طرح ہیں جس میں جتنا زیادہ اور خوبصورت دیدہ زیب رنگوں کا ملاپ کیا جائے وہ اتنی ہی خوبصورت نظر آئے گی۔"

لوہار نے کہا : "لوہے کی سخت سے سخت چیز پگھل کر دوسری شے میں تبدیل ہو سکتی ہے لیکن بچوں کی تربیت آگ چل کر لوہے سے بھی زیادہ سخت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ بچے کو اس انداز سے تربیت دینی چاہئے کہ وہ دنیا کی کسی بھی طاقت سے نہ پگھل سکے، اگر پگھلے تو مصیبت میں گرفتار کسی شخص کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر۔"

بڑھئی نے کہا : "کسی بھی درخت کو مختلف پہلوؤں سے کاٹ کر میز بنانا مشکل نہیں جتنا بچے کو مختلف پہلوؤں سے تربیت دے کر انسان بنانا مشکل ہے۔"

درزی نے کہا : "بچے ایک بغیر سلے کپڑے کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی تراش خراش میں جتنی زیادہ محنت کی جائے گی وہ اتنے ہی زیادہ دیدہ زیب بنیں گے۔"

طبیب نے کہا : "بچے ایک ایسی دوا کی حیثیت رکھتے ہیں جو دل و دماغ کو سکون اور خوشی بخشتی ہے جو صحت کے لئے ضروری ہے۔"

شاعر نے کہا : "بچے پیار، محبت، معصومیت اور پاکیزگی کا حسین امتزاج ہیں۔"

ادیب نے کہا : "بچے ایک کتاب کی مانند ہیں جس کو جتنا پڑھو اتنا ہی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔"

ماں نے کہا : "بچے پھول ہیں جو طرح طرح کی خوشبوؤں اور دیدہ زیب رنگوں میں دنیا کے ہر باغ میں موجود ہیں۔"

باپ نے کہا : "دنیا میں کوئی چیز بچے کی مسکراہٹ سے زیادہ خوبصورت نہیں۔ اس مسکراہٹ میں اتنی طاقت ہے کہ سارے دن کی مشقت اور تھکن ایک پل میں ختم کر سکتی ہے۔"

بزرگ نے کہا! : "بچے کی معصومیت دیکھ کر ایک دفعہ میں نے کسی بچے سے کہا کہ اگر میں تمہیں ایک لاکھ روپے دوں تو تم کیا چیز خریدو گے؟" بچے نے معصومیت سے جواب دیا "غبارہ۔"

مزید محنت کی ضرورت ہے

"مارکوپولو" عرفان احمد جھٹیال، گھوٹکی۔ "انجام کا خوف" "میرا مقدر" "چچا برف والے" محمد عثمان، جالپر۔ "دنیا" "علم کی شمع" سارہ مصطفیٰ، کراچی۔ "خواہش" قمر علی عباس، کراچی۔ "کفایت شعاری" فدا محمد قمر، حویلیاں۔ "نام روشن پاکستان کا" محمد ریاض لاشاری، جیکب آباد۔ "جاہل" عبدالسلام کراچی۔ "ادھورا خواب" منصور احمد مگسی، کندھ کوٹ۔ "ایک نصیحت" نور حسین مری، میرپور خاص۔ "بے درد زمانہ" "عابد حسین چانڈیو، لاڑکانہ۔ "قسمت کا مارا" "حمل پرواز" "تربت" محمد بن قاسم" "عظیم سرمایہ" خالد محمود مغل، ملتان۔ "تتلی" گلشن آرا، کنری پاک۔ "پاک سرزمین" فیصل محمود، کراچی۔ "محنت کا صلہ" محسن علی چنگیزی۔ "معاہدہ" سید فیضان علی شاہ، ایبٹ آباد۔ "استاد کی عظمت" عبدالقدیر انڈھڑ، پنوں عاقل۔ "ہم چھوٹے چھوٹے بچے ہیں" "سردیوں کے دن تھے" ظاہر سلیمان، لاہور۔ "سفید جہاز" رضوانہ سعید، "فقیر کی بد دعا" "پاک فضائیہ کے نام" عماد حسین یاد، لاہور۔ "سیکھو" جواہر، کندھ کوٹ۔ "جیسی کرنی ویسی بھرنی" محمد حنیف، حیدر آباد۔ "چوکے چھکے اور چچا جان" عامر اقبال، پشاور شہر۔ "چڑیا گھر کی سیر" محمد احسان، کراچی۔ "فیصلہ" علی مدد عباسی، لاڑکانہ۔ "کون بچائے گا" محمد عمر، ہری پور۔ "چوری کی سزا" محمد فاروق، مشتاق چوہدری، نارووال۔ "عقل اور قسمت" عنایت اللہ، کندھ کوٹ۔

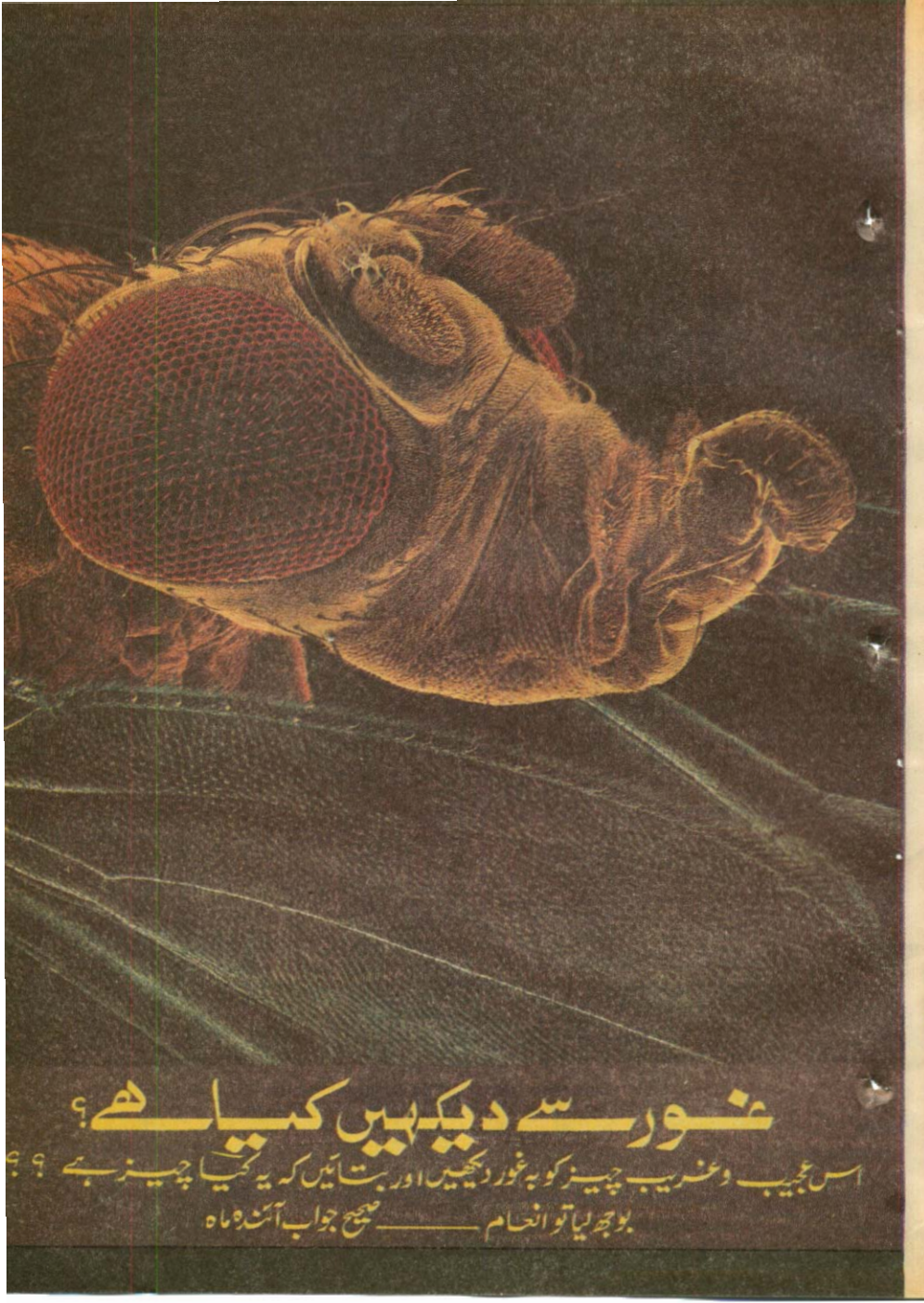

غور سے دیکھیں کیا ہے؟

اس عجیب و غریب چیز کو بہ غور دیکھیں اور بتائیں کہ یہ کیا چیز ہے ؟ ؟ ؟

بوجھ لیا تو انعام ــــــ صحیح جواب آئندہ ماہ

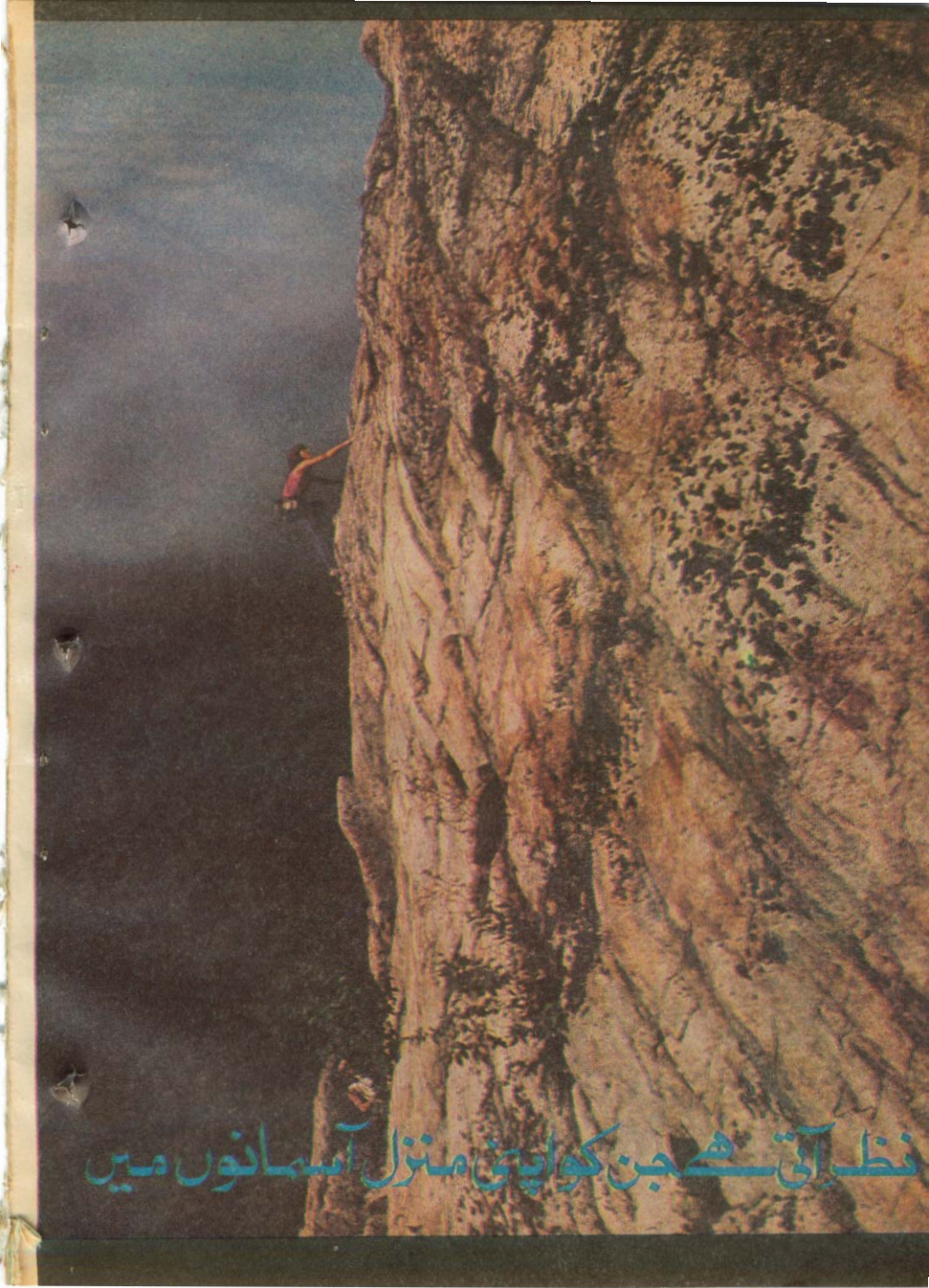
نظر آتی ہے جن کو اپنی منزل آسمانوں میں

قصّہ کوئز ۲

سلیم مغل

> دلوں میں اتر جانے والے اور ذہن کو متاثر کرنے والے قصّے جذبوں میں نئی روح پھونک دینے والے حقائق اور عزم کو نئی مہمیز عطا کرنے والے واقعات کی تاریخ سے چند واقعات آپ کے مطالعے کے لئے حاضر ہیں۔ ہر واقعے کے اختتام پر دو سوال سر اٹھاتے ہیں۔ گویا دس سوالوں کا جواب آپ کو دینا ہے۔ بہت سے انعامات آپ کے منتظر ہیں جواب کے ساتھ کوپن کا آنا شرط ہے (مرتب)

قصہ کوئز نمبرا کے درست جوابات

۱- موجد کا نام الیگزینڈر فلیمنگ ہے۔

فلیمنگ نے پنسلین ایجاد کی۔

۲- روح پرور خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا یہ خطاب حج کے موقع پر میدان عرفات میں کیا گیا۔

۳- بچے کا نام سرسید احمد خان ہے۔

سرسید احمد خان کا عظیم کارنامہ علی گڑھ کالج کا قیام تھا۔

۴- بہرہ ہو جانے والا سائنس دان ایڈیسن تھا۔

ایڈیسن نے بجلی کا بلب، فونو گراف، میمیو گراف، کینٹو سکوپ بیٹری، مصنوعی ربڑ اور چھوٹی بڑی دیگر ایجادات کو ملا کر ایک ہزار سے زیادہ ایجادات کیں۔

۵- شعر مولانا محمد علی جوہر کا ہے جو تحریک خلافت کے نامور رہنما تھے۔ ان پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا تھا۔

انعام حاصل کرنے والے ۷ خوش نصیبوں کا اعلان

گزشتہ شمارے میں ۱۰ انعامات کا اعلان کیا گیا تھا مگر بدقسمتی سے زیادہ تر شرکاء سے کوئی نہ کوئی غلطی سرزد ہوئی اِس لئے مجبوراً" سات ساتھیوں کو انعام کے لئے منتخب کیا گیا۔ ۱۵ اکتوبر ۹۶ء تک انعام نہ ملنے کی صورت میں دفتر آنکھ مچولی کے پتے پر اطلاع کریں۔

۱- سائرہ سلطان، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔
۲- ظفر اقبال، جہانگیر روڈ، کراچی۔
۳- محمد عمیر قاسم، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔
۴- عاصم امتیاز، والٹن، لاہور۔
۵- محمد شاہد حفیظ، لیاقت آباد، کراچی۔
۶- سائرہ ممتاز ملیر، کراچی۔
۷- محمد شعیب حسن، اقبال ٹاؤن، لاہور۔

۱- ملک میں شدید قحط سالی تھی، گرمی کا موسم پورے شباب پر تھا فصلیں پکنے کے قریب تھیں۔ سواریوں اور سامان ڈھونے کا انتظام کرنا دشوار تھا۔ ان حالات میں شام کی سرحدوں پر قیصر نے اپنی فوجوں کے ساتھ مسلمانوں پر حملے کی تیاریاں شروع کر رکھی تھیں۔ اس سرزمین کی بہ ظاہر سب سے بڑی قوت اسلام کے نام لیواؤں کو یکسر ختم کردینے کے درپے تھی۔ مسلمانوں کو احساس تھا کہ اس موقع پر کمزوری دکھانے کا مطلب اپنی بساط کو الٹ دینا ہے۔ چنانچہ تمام مسلمانوں نے پورے جوش و جذبے کے ساتھ جنگ کی تیاری شروع کی مال و اسباب کی فراہمی میں ہر ایک نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے بڑی بڑی رقمیں پیش کیں۔ غریب صحابیوںؓ نے اپنی دن بھر کی کمائی نذر کی، عورتوں نے اپنے زیور اتار کر دے دیئے، جو کچھ نہ کرسکے وہ اس ملال سے روتے رہے کہ وہ کیوں کچھ نہ کرسکے۔ ایثار و قربانی کی ایسی مثالیں پوری اسلامی تاریخ میں کہیں اور نہیں ملتیں جو اس موقعہ پر نظر آئیں۔

۱- بتایئے تو یہ کون سی جنگ کی تیاری تھی؟

۲- کون تھا جو اپنے گھر کا سارا سامان اٹھالایا اور کہا کہ "یارسول اللہؐ میں اپنے گھر میں صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت چھوڑ آیا ہوں؟"

۲- "میں نے کہا، میں پینٹر بنوں گا" میرے والد نے کہا، "نہیں "تم پینٹر نہیں بن سکتے۔" میں نے کہا "بنوں گا....." باپ نے کہا "ہرگز نہیں....." مجھے خیال آیا کہ میرا باپ ضد کا پکا ہے، وہ جس بات پر اڑ جائے اس سے ہٹتا نہیں۔ اگلے ہی لمحے مجھے خیال آیا کہ، آخر میں بھی تو اسی باپ کا بیٹا ہوں، مجھے کسی بھی طرح اپنے باپ سے پیچھے نہیں ہونا چاہئے..... بس پھر کیا تھا، میں نے اپنا حتمی فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ "میں پینٹر بنوں گا اور میں پینٹر بن گیا۔"

۱- یہ بات جس شخصیت نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھی ہے اس کا نام کیا ہے.....؟

۲- پوری دنیا کو جنگ کے جہنم میں دھکیل دینے والی اس شخصیت کا تعلق کس ملک سے تھا؟

۳- ننھی سی گلہری کی دُم ایک بڑے سے پتھر میں اس طرح پھنس گئی تھی کہ پوری کوشش کے باوجود دُم نکل نہیں پارہی تھی۔ گلہری "چوں چوں" کرکے اپنی تکلیف کا اظہار کررہی تھی یا شاید

کسی کو اپنی مدد کے لئے پکار رہی تھی۔ قریب ہی سے گزرنے والے بچے نے جب گلہری کو اس عالم میں دیکھا تو فوراً ہی اس کی مدد کو لپکا۔ مگر پتھر بھاری تھا اور بچہ کم سن۔ بچے کے ناتواں ہاتھ پتھر کو نہ ہٹا سکے اور گلہری مسلسل "چوں چوں" کرتی رہی۔ بچہ بھاگتا ہوا اپنے گھر گیا اور لوہے کی ایک سلاخ لے آیا۔ اس سلاخ کی مدد سے پتھر بہ آسانی کھسک گیا اور گلہری آزاد ہو گئی۔ یہ ذہین اور رحم دل بچہ بڑا ہوا تو حکمران بنا۔ حکمران بن کر اس نے غلاموں کو آزادی دلوائی اور جمہوریت کی بقاء کے لئے بہت سے کام کئے۔ سیاست کی تاریخ میں اس کا نام ہمیشہ تابندہ رہے گا۔

۱۔ حکمران کا نام بتایئے؟

۲۔ اپنے ملک کے حکمرانوں میں ترتیب کے اعتبار سے اس کا نمبر کون سا ہے؟

۴۔ "میرے ہاتھ کو غور سے دیکھو' ہاتھ کی پانچوں انگلیاں اگر ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں تو کس قدر کمزور ہوتی ہیں لیکن اگر ان انگلیوں کو باہم ملا دیا جائے تو یہ مکّہ بن جاتا ہے یہ مکّہ بڑے سے بڑے دشمن کے دانت توڑ سکتا ہے۔" مکّے کے حوالے سے یہ مخصوص لب و لہجہ تحریک پاکستان کے ایک نامور قائد کا ہے جنہیں شہید کر دیا گیا۔

۱۔ آپ ان کے نام کے علاوہ یہ بھی بتایئے کہ انہیں کس شہر میں شہید کیا گیا؟

۲۔ قاتل کا نام کیا تھا؟

۵۔ جنگ کریمیا زوروں پر تھی اور خبریں آ رہی تھیں کہ اس جنگ میں زخمی ہونے والوں کی خبر گیری ٹھیک سے نہیں ہو رہی۔ اُس نے وزیرِ جنگ کو لکھا کہ میں زخمیوں کی دیکھ بھال کے لئے اپنی خدمات پیش کرنا چاہتی ہوں"۔ اسے اجازت دے دی گئی اور وہ اپنی ۳۸ ساتھی نرسوں کے ساتھ کریمیا کی جانب چل دی۔ روز و شب آرام اور کسی توقف کے بغیر وہ زخمیوں کی دیکھ بھال کرتی' کام میں مصروف رہتی' ہسپتال کی صفائی کرتی' مریضوں کے بستروں تک جا کر انہیں حوصلہ دیتی اور ان میں زندگی کی امنگ پیدا کرتی۔ اس کی کوششوں کے باعث زخمیوں میں شرح اموات ۴۲ فی صد سے کم ہوتے ہوتے ۲ فیصد تک آ گئی۔

۱۔ دردمند دل رکھنے والی اور مریضوں کو زندگی کا پیغام دینے والی یہ خاتون کون تھی؟

۲۔ اس کا تعلق کس ملک سے تھا؟

نامے میرے نام

میری آنکھوں کے سامنے خطوط کا انبار ہے۔ میں ان کی ایک ایک سطر سے گزرا ہوں اِن خطوط میں درج تمام اہم باتیں نشان زد کی ہیں تاکہ ان کا جواب دیا جاسکے۔ ان خطوط کو پڑھنے سے قبل جب میں نے دیکھا تھا تو سوچتا تھا کہ میں دُور کہیں دُور بھاگ جاؤں' اتنی دُور جہاں پر مجھے ان خطوں میں اٹھائے گئے سوالوں کی جواب دہی کا احساس پریشان نہ کرے اور جہاں پر مجھے یہ ڈر بھی نہ ہو کہ مجھے یہ سینکڑوں خطوط پڑھ کر پھر ان کے جواب بھی دینا ہیں۔ میں نے ہمت کرکے جب خط پڑھنے کا آغاز کیا تو پھر پڑھتا ہی چلا گیا۔ ہر خط محبت کی خوشبو میں رچا ہوا' شکوے اور شکایتیں بھی ہیں' مگر ہر شکوے میں اپنائیت ہے' ہر شکایت میں محبت ہے ایسا نہ ہو تو آپ سب ہمیں خط لکھتے ہی کیوں؟ ہماری غلطیوں پر ہمیں برا بھلا کہہ کر چپ سادھ لیتے مگر آپ نے ایسا نہیں کیا' ہمیں خط لکھا' ہم سے لڑ جھگڑ بھی لئے' ہمارا دل بھی رکھنے کی کوشش کی۔ یہ ساری باتیں ٹھیک سہی مگر اس کے باوجود اس مسئلے کا کیا کریں کہ سینکڑوں خطوں کا جواب ایک ہی شمارے میں دیا جائے؟ ہم نے خطوں

کو پھر سے پڑھنا شروع کیا اور اب کے یہ طے کرلیا کہ جو خط ہمیں جواب دینے پر مجبور کردے گا بس ہم اسی کا جواب دیں گے۔ یوں ہمارا مسئلہ حل ہوگیا۔

اب دیکھئے ناں پشاور سے جمال خان یوسف زئی نے جو خط ہمیں لکھا ہے اسے پڑھنے کے بعد کون ہوگا جس کا جی نہ چاہے کہ وہ اس کا جواب ضرور دے۔ جمال خان لکھتے ہیں۔ "اڑے تم لوگ پاغل تو نہیں ہے.... انتالیٹ رسالہ چھاپا ہے۔ تم لوگ کو اللہ کا قسم ہے سچ بولو کہ تم لوگ رسالہ دیر سے چھاپتا ہے یا ہمارا دوکان والا گڑبڑ کرتا ہے۔ اگر دوکان والے کا غلطی ہے تو ہم لوگ اس سے جھگڑا کرے گا مگر تم غلط نہیں بولو۔"

دیکھئے ہے نا مزے دار خط' جمال صاحب ہم کو اللہ کا قسم ہے' آنکھ مچولی ہماری غلطی سے لیٹ ہوجاتا ہے۔ مگر اب نہیں ہوگا۔ آپ نے یہ شمارہ پچھلے رسالے کے مقابلے میں جلدی حاصل کرلیا ہوگا۔ آئندہ ماہ یہ اور بھی جلدی آئے گا۔ وعدہ' مگر ایک وعدہ آپ بھی کریں کہ دوکان دار سے جھگڑا نہیں کریں گے۔ غصے سے بھرا ہوا یہ واحد خط نہیں تھا اور بھی ایسے بہت سے خطوط ہیں۔

کراچی سے صوفیہ سلطانہ لکھتی ہیں "مجھے اپنا نام "مزید محنت" والے کالم میں دیکھ کر غصہ نہیں آیا بلکہ یہ دیکھ کر غصہ آیا کہ آپ نے میرا نام اس کالم میں شائع کیا جہاں لکھا تھا "نام شائع نہیں کیا تو بے عزتی ہوجائے گی"۔ حالانکہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں لکھی تھی۔ مجھے فالتو میں نام شائع کروانے کا کوئی شوق نہیں۔ سمجھے؟ فوراً" میرا غصہ ٹھنڈا کریں۔--- صوفیہ جلدی سے ٹھنڈے پانی کا جگ سر پر انڈیل لیجئے' غصہ ٹھنڈا ہوجائے گا یا پھر ایسا کرتے ہیں کہ بچوں کی طرح یہ کہہ کر لڑائی ختم کرتے ہیں کہ "لڑائی لڑائی معاف کرو.....۔"

محمد خرم معراج نے سکھر سے معاوضوں کی بابت لکھا ہے--- خرم صاحب آپ بہت جلد دیکھیں گے کہ آنکھ مچولی پہلے کی طرح قابلِ اشاعت تحریروں پر معاوضے دے گا۔ ان دنوں ہم ادائیگیوں کے سلسلے میں کوئی فارمولا وضع کرنے کے چکر میں ہیں' کوئی ایسا فارمولا جس سے ناانصافی کے در بند ہوجائیں اور تحریریں معیار کے مطابق معاوضہ حاصل کرسکیں۔ آپ جلد ہی خوشخبری سنیں گے۔

عادل خان' ٹوپی محلہ بونیر نے سرحد سے خوشخبری دی ہے کہ "حکومت نے چونکہ کاغذ پر ڈیوٹی کم کردی ہے اس لئے آپ اس کی قیمت کم کردیں۔".....

عادل خان آپ کے منہ میں گھی' شکر۔ آپ ایسی اچھی اچھی خبریں دیا کریں' وقتی طور پر خوشی سی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اوپن مارکیٹ سے کاغذ خریدتے ہیں اور کبھی مارکیٹ سے کاغذ اس طرح کم قیمت پر نہیں ملتا جس طرح بڑے اخبارات کو کوٹے پر ملتا ہے اور پھر دیگر عوامل بھی تو ہیں' کمپوزنگ' اسکیچز' فلمیں'

سیبریشن، پرنٹنگ اور نہ جانے کیا کیا کچھ ان سب کی بڑھی ہوئی قیمتوں کو کون نیچے لائے گا؟ آپ یقین کیجئے آنکھ مچولی معیار پر خرچ کرتا ہے اور اسی کا معاوضہ آپ سے طلب کرتا ہے۔ آپ اس بات کو مان لیں کہ آنکھ مچولی منفعت بخش پرچہ نہیں ہے ورنہ ہی اس کا مقصد کمائی کرنا ہے۔

عطیۃ النساء نے اسلام آباد سے ۸ صفحات پر مشتمل خط لکھا ہے۔ خط کا آغاز کرنے سے قبل انہوں نے ہمارا تصوراتی خاکہ بنایا ہے جس میں مدیر کی ناک ہاتھی کی سونڈ سے بھی بڑی ہے اور کانوں کی جگہ باٹا کے دو جوتے لٹک رہے ہیں۔ ایسا ہی کچھ حشر انہوں نے خط کے آخر میں بھی کیا ہے اور ایک خوفناک اسکیچ کے نیچے لکھا ہے "تیرے مکھڑے دا کالا کالا تل وے"۔ اس تصویر میں جو تل بنایا ہے وہ بلا مبالغہ روٹی پکانے والے توے سے بھی بڑا ہے۔ اس پورے خط میں، غصہ ہے، ناراضگی ہے، کوسنے ہیں، بددعائیں ہیں اور یہ سب کچھ ان کی تحریریں شائع نہ ہونے پر ہوا ہے۔ ہمیں یہ خط بالکل برا نہیں لگا بلکہ سچ مچ اچھا لگا۔ بہن عطیہ سے کہنا ہے..... عطیہ آپ پھر سے لکھیں، جی جان سے محنت کرکے لکھیں، اپنی تحریر بھجوانے سے قبل کسی کو دکھا بھی لیں۔ آپ کی تحریر آئندہ ضرور لگے گی۔

پسنی مکران سے طاؤد بلوچ نے اور عبدالرسول سومرو نے **خجک سبی** سے خط لکھا ہے۔ آنکھ مچولی کو پسند کیا ہے، دعائیں دی ہیں، پرچے کی تاخیر سے آنے پر توجہ دلوائی ہے۔ ان دونوں دوستوں کے خطوط آنکھ مچولی سے اور علم سے ان کے لگاؤ کے مظہر ہیں۔ مکران کی سنگلاخ چٹانوں میں اور سبی کے بے آب و گیاہ علاقے میں ایسے عظیم دوست رہتے ہیں، تحریروں سے اتنی محبت کرتے ہیں، پڑھنے اور لکھنے کا یہ شوق دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان کے دل اور دماغ کو علم کی روشنیوں سے منور رکھے۔

بوریوالہ سے وسیم اطہر نے ملا نصیرالدین کی ایک تحریر کی طرف توجہ دلوائی ہے کہ "وہ تحریر ہما عثمان کی نہیں۔"..... چلو اطہر بھائی اس بار ہما عثمان کو معاف کیا اللہ بھی معاف کرے۔ ہما آئندہ ایسا نہیں کریں گی۔ ویسے آپ نے خوب چوری پکڑی۔ اندازہ ہوا کہ آپ رسائل کو کس توجہ سے پڑھتے ہیں۔

رحیم یار خان کی طیبہ صدف کہتی ہیں کہ آپ نے ستمبر کے شمارے میں دو کہانیوں کے عنوان ہی بدل دیئے..... ہاں بھئی طیبہ غلطی ہوگئی۔ آپ کے علاوہ بھی بہت سے قارئین نے اس طرف توجہ دلائی ہے۔ ہم بے حد شرمسار ہیں۔ طیبہ آپ کی کہانی کی تلاش جاری ہے جونہی کہانی مل گئی اس کے ساتھ مناسب سلوک کیا جائے گا۔

گلبرگ کراچی سے شگفتہ صدیقی کا خط اتنا مزے دار ہے کہ ہمارا جی چاہ رہا ہے کہ اس خط کو حرف بہ حرف شائع کردیں مگر پھر وہی صفحات کی قید..... شگفتہ

آپ امتحان میں پاس ہو گئیں اور مٹھائی تک نہ کھلائی یہ ہے نا غلط بات! آپ کو بہت مبارک۔

اسلام آباد کے محمد ریحان صاحب دیکھئے ہم ان صفحات کے ذریعہ اعلان کر رہے ہیں کہ "کچھوے اور خرگوش" کی کہانی کسی نے بھی لکھی ہو لیکن اسے بھجوایا آپ نے تھا..... ٹھیک ہے نا۔ اب تو آپ مطمئن ہو گئے۔

حافظ ممتاز صاحب نے سنگھوئی ضلع جہلم سے خط لکھ کر بہت سے دینی معاملات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ہم ان کے شکر گزار ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ ان کی اچھی تجاویز پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں گے۔

شیخ عبدالحمید عابد صاحب، کامونکے گجرانوالہ سے رقم طراز ہیں انہوں نے ہماری کمزوریوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ شیخ صاحب آپ اور عاکف حمید صاحب آنکھ مچولی سے دیرینہ رفاقت اور خصوصی تعلق کے پیش نظر ہماری گزشتہ غلطیاں درگزر کردیں۔ آپ کے شکوے جلد دور ہو جائیں گے۔ آپ نے جو دعائیں دی ہیں اس سے دل بڑا ہو گیا۔

گجرانوالہ سے حمیرا ناز سرور کا جو خط آیا ہے، یہ طویل بھی ہے اور مزے دار بھی خط کے آخر میں خود ہی لکھتی ہیں "اچھا اب بس کرتی ہوں۔ ورنہ آپ بھی کہیں گے کہ لڑکی ہے کہ مکھی۔ پیچھے ہی پڑ گئی۔ کھی کھی کھی....." یہ خط پراندے (یعنی چٹیا) کے سنہری دھاگوں کے ایک لچھے سے بندھا ہوا ہے۔ اگر یہ تھوڑا سا اور طویل ہو جاتا تو اسے رسیوں کی مدد سے باندھنا پڑتا حمیرا آپ نے آنکھ مچولی کے خاص نمبر کے لئے جو عنوانات تجویز کئے ہیں وہ مختلف تو ہیں لیکن اس پر مواد کا حصول دشوار ہو گا۔ اب یہ بات ہمارے پڑھنے اور لکھنے والے ہی بتا سکیں گے کہ "خواہش نمبر" "یادیں نمبر" اور "دوستی نمبر" کتنے دلچسپ ہو سکتے ہیں۔ تاہم اتنا وقت نکال کر اتنا طویل اور مزے دار خط لکھنے کا شکریہ۔

چند خطوط جن کے جواب دینا ضروری سمجھ رہا تھا مگر اب ممکن نظر نہیں آرہا ان کا مختصر ذکر کردوں۔ سید ذیشان حیدر، کامرہ اٹک۔ شاہد الرحمٰن چوہدری، سرگودھا۔ محمد اطہر زبیری، حب چوکی۔ شازیہ مشتاق اعظمی، محمد عمر قریشی، اسلام آباد۔ ساجد نور، پسنی مکران۔ محمد رمضان ساقی، فیصل آباد۔ عمارہ ثناء، مظفر گڑھ۔ سیدہ رباب، مدینہ گجرات۔ ذیشان، محمد نگر کوہاٹ۔ آپ سب سے بے حد معذرت، آپ کے خط اچھے تھے جی چاہ رہا ہے کہ آپ سے فرداً فرداً مخاطب ہوا جائے مگر اب ممکن نہیں رہا۔ معذرت! واللہ حافظ۔

سوا سیر

الطاف حسین

"الطاف!..... الطاف!

ہم پلٹ کر دیکھنے کی حماقت کئے بغیر چلتے رہے۔ یار ٹھہرو ناں..... ذرا بات تو سنو" آواز دوبارہ سنائی دی۔

ہم نہ چاہتے ہوئے بھی رک گئے۔ پلٹ کر دیکھا تو حمید ڈھول اپنی توند کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ناک کی سیدھ میں سی گیند کی طرح ——— لڑھکتا چلا آرہا ۔ ہمیں پکڑنے کے چکر میں انہوں نے راستے میں پڑے پتھر کو جو نظر انداز کیا تو دھڑام سے زمین پر "مکمل" سجدہ ریز ہوگئے۔ لیٹے لیٹے الٹے ہاتھ سے ماتھے پر بننے والے "آلو" کو ٹٹول کر جسامت کا تعین کیا اور پھر اسی جسامت کے عین مطابق ایک عدد بے نقط تفسیر پتھر کی خدمت میں پیش کی۔ موصوف اٹھ کر بیٹھے دو جمع چار برابر چھ لمبے لمبے سانس لیے۔ پھر توند کو

سنبھالتے ہوئے اونٹ کے سے انداز میں کھڑے ہو کر انتہائی غصے کے عالم میں پتھر پر لعنت برساتے ہوئے ایک عدد خصوصی بددعا نشر کی۔

"اللہ کرے تجھ پر این ایل سی کا ٹریلر چڑھے اور تیرا بھرکس نکل جائے ..... منحوس .... تو نے مجھے سبزی فروش بنادیا ہے۔"

اس کارِ خیر سے فارغ ہو کر انہوں نے ایک بار پھر ماتھے پر بنے "آلو" کو ٹٹولا اور پھر ہماری جانب متوجہ ہوئے۔ "یار اگر تم پہلی صدا پر ٹہر جاتے تو ماتھے پر "یہ تو نہ بنتا" انہوں نے ماتھے پر بننے والے "اسپیڈ بریکر" کی طرف اشارہ کیا۔

"سوری سر..... غلطی ہوگئی..... میں نے سنا نہیں تھا" ہم نے معذرت کرتے ہوئے منہ پھلا لیا۔

اوہ! میرا یار تو ناراض ہوگیا ..... دوستوں سے اس طرح ناراض نہیں ہوا کرتے ..... سمجھے ..... اور سنا کیسا ہے تو؟ کدھر جارہا ہے؟ کدھر سے آرہا ہے؟"

ہمارا رویہ بدلتا دیکھ کر انہوں نے فوراً اپنے انداز میں ترمیم کی اور ہمیں اپنے بڑے بڑے بازوؤں میں جکڑتے ہوئے تین عدد سوالات داغ دیئے۔

"ٹھیک ہوں!..... بازار جارہا ہوں..... گھر سے آرہا ہوں!"

"میں نے تیری خیریت پوچھی ہے یار..... کوئی پیسے تو نہیں مانگے ..... اب غصہ تھوک دے ..... شاباش" انہوں نے بات بنانے کی ایک اور کوشش کی۔ لیکن ہمیں معلوم تھا کہ ان کی نظریں مسلسل ہماری پھولی ہوئی جیب کا طواف کررہی ہیں۔

"سنا ہے آج دادا جان نے "عنایت" کی ہے ..... تو پھر کیا پروگرام ہے تمہارا؟" انہوں نے ہمیں خاموش پاکر للچائی ہوئی نظروں سے ہماری جیب کی طرف دیکھتے ہوئے آخر مطلب کی بات کرہی دی۔

ان کی "ندیدی" نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے ہم نے جیب پر ہاتھ کا کنٹرول کچھ اور سخت کردیا۔

"پروگرام؟ ..... کیسا پروگرام؟" ہم نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ "پیارے! اتنے انجان بھی نہ بنو کہ انجان بھی شرمائیں ..... تم نے پچھلے ماہ کی پندرہ تاریخ کو نیم کے درخت کے نیچے رات نو بج کر بیس منٹ پر مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اس بار دادا جان سے وصولی ہوگی تو تمہاری دعوت کروں گا۔ وعدہ شکن ..... کہاں گیا تیرا وہ وعدہ؟ انہوں نے ہمیں جھنجھوڑتے ہوئے وعدہ یاد دلایا۔

ہم ان کی "ہضم خور" یاداشت پر کانپ کر رہ

گئے۔

"کم بخت! کتنا ذہین ہے کھانے پینے کے معاملات ذرا بھی نہیں بھولتا اور اسکول کا سبق روز بھول جاتا ہے۔" ہم نے انہیں دل ہی دل میں کوس ڈالا۔

کیا سوچ رہے ہو بجن..... ٹائم دو ٹائم..... وہ شخص مسلمان نہیں جسے اپنی زبان کا پاس نہیں۔" انہوں نے ہمیں "موٹیویٹ" کرنے کے لئے ایک اور حملہ کیا۔ غالباً موصوف ایک دوبار ناکام ہو کر چین سے بیٹھنے والوں کی بجائے فتح کے یقین کے ساتھ سترہ تک جانے والوں میں سے تھے۔ (لیکن صرف کھانے کے معاملات میں)

اگر میں ایسا نہ کروں تو....." ہم نے جان بوجھ کر جملہ ادھورہ چھوڑ دیا۔

"تو پھر ہمیں دعوت بالجبر کے ساتھ تمہیں زبردستی مسلمان بنانا پڑے گا۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے بازوؤں کی گرفت کچھ اور "کلوز" کردی۔ ہم ٹہرے سنگل پسلی یہ جبر برداشت نہ کرسکے اور ہماری چیں بول گئی۔

"اللہ کے واسطے..... رحم..... سرکار میں اپنے وعدے پر قائم ہوں..... یہ سب جو کیا مذاق تھا۔" ہم نے اپنی ہڈی پسلی ایک ہوتے دیکھی تو فوراً "تائب" ہوگئے۔

"ہر چیز اپنے وقت پر اچھی لگتی ہے..... تم ہو تو خاندانی سعادت مند، لیکن کبھی کبھی شرارتی ہوجاتے ہو..... بات مانتے ہو لیکن ذرا..... دیر سے" وہ ہمیں مشروط طور پر آزاد کرتے ہوئے بولے۔

"کل کا پروگرام مناسب نہیں رہے گا۔"

"خبردار..... خبردار..... جو کل کی بات کی ..... ہمارے بزرگ کہہ گئے ہیں آج کا کام کل پر کبھی نہ ٹالو..... جو قومیں ایسا کرتی ہیں یعنی آج کو کل پر ٹالتی ہیں وہ کبھی ترقی نہیں کرسکتیں..... اور ہم..... ترقی کرنا چاہتے ہیں۔"

"توند میں!" ہم نے دل ہی دل میں جملہ مکمل کیا۔ وہ ہمیں جواب طلب نظروں سے گھور رہے تھے۔

"ٹھیک ہے تمہارا آج رات کا کھانا میری طرف سے۔"

"رات کا! نہیں..... دوپہر کا..... میں ٹھیک بارہ بجے تمہارے گھر پہنچ جاؤں گا..... اور..... اور کھانا گھر میں نہیں کسی ریسٹورنٹ میں کھاؤں گا ..... اگر تم نے ادھر ادھر ہونے کی کوشش کی تو ....." ان کا آخری جملہ "تھریٹ" سے بھرپور تھا۔

"اچھا! ٹھیک ہے!" ہم نے مردہ دلی سے حامی بھرلی۔

"یوں نہیں..... ہنس کر کہو۔"

"اچھا ٹھیک ہے یار" ہم نے دانت پیستے ہوئے زبردستی ہنسنے کی کوشش کی اور یوں لگا۔ جیسے ہم رو رہے ہوں۔

"میں چلتا ہوں اب کھانے پر ہی ملاقات ہوگی۔" ہاتھ ملا کر وہ رخصت ہوئے اور ہم دور تک "لڑھکتے پتھر" کو جاتا دیکھتے رہے۔ بعد ازاں بازار جانے کا پروگرام یک قدم موقوف کرتے ہوئے بوجھل چال سے واپس گھر کی طرف چل دیئے۔

☆ --- ☆ --- ☆

وال کلاک نے جوں ہی دن کے گیارہ بجنے کا اعلان کیا دروازہ ڈھولک کی طرز پر بجایا جانے لگا۔ گویا منحوس گھڑی وقت کی گھڑی سے ایک گھنٹہ پہلے ہی آگئی تھی۔ قبل اس کے کہ ہم بچاؤ کی کوئی تدبیر سوچتے گلو نے دروازہ کھول کر انہیں "انٹری" دے دی۔

"السلام علیکم سر!" انہوں نے ہمارے کمرے میں قدم "رنج" فرماتے ہوئے تیں نیکیاں حاصل کیں۔

"و..... علیہ..... کم..... السلام!" ہم نے درد دل چھپاتے ہوئے انہیں سر سے پاؤں تک نظر بھر کر دیکھا۔

بلیو کلیکشن میں ملبوس، پاؤں میں پشوری چپل، ہاتھ میں سرخ رنگ کا (علامتی) رومال اور سر پر ٹوپی برائے گنج پوشی اور مونچھیں موم آراستہ!

"بیٹھنے کا نہیں کہو گے؟" وہ ہمیں گھور کر بولے

"بیٹھ جایئے یئے یئے یئے یئے حضور!" ہم نے جایئے کی "ے" کو خوب طول دیتے ہوئے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اگلے لمحہ صوفہ زیر بار تھا۔

"شکریہ! شکریہ"

"ابھی تو....."

"جی ہاں مجھے علم ہے کہ ابھی تو گیارہ بجے ہیں۔" وہ ہماری بات کاٹتے ہوئے بولے میں نے سوچا تم انتظار میں بور ہو رہے ہو گے اس لئے جلدی آگیا..... ویسے بھی گھر میں کوئی کام وغیرہ نہیں تھا..... سو ادھر چلا آیا..... اگر ناراض ہوتے ہو تو چلا جاتا ہوں..... اپنے ٹائم پر آجاؤں گا۔"

ارے نہیں یار..... بیٹھو بیٹھو..... تمہارا اپنا گھر ہے سو بار آؤ سو بار جاؤ..... تمہیں کس نے منع کیا ہے!" ہم نے اخلاقاً" کہا اور وہ جواباً" چپل اتار کر صوفے پر لیٹ گئے۔

☆ --- ☆ --- ☆

جس وقت ہم گھر سے تیار ہو کر نکلے اس وقت ہماری گھڑی اور صورت، دونوں پر ٹھیک

بارہ بج رہے تھے۔ گھر سے ریسٹورنٹ تک کا سفر خاموشی سے طے کیا گیا۔

"کیا ہوا ہمارے یار کو..... آج بہت چپ چپ سا دکھائی دے رہا ہے کچھ بولتا ہی..... نہیں ہے۔" انہوں نے ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے ہوئے جلتی پر تیل چھڑکا۔

"کوئی بات نہیں!" ہم نے مختصر سا جواب دیا اور ایک کونے میں موجود خالی میز کی طرف بڑھ گئے۔

"سر کیا کھانا پسند کریں گے؟" ویٹر ہمارے بیٹھتے ہی جن کی طرح نازل ہوگیا۔

"کھانے میں کیا کیا ہے؟"

جواب میں ویٹر نے رٹو طوطے کی طرح آج کا مینو سنادیا۔

"پہلے فرائی گوشت ..... درجن کباب اور دس بارہ روٹیاں لے آؤ"

ہمارے کچھ کہنے سے پہلے ہی حمید ڈھول نے آرڈر پاس کردیا۔

"پہلے سے کیا مراد ہے سر!" ویٹر کے لہجے میں حیرت نمایاں تھی۔

"عقل مند آدمی! قسطوں میں کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے"

ان کی وضاحت سن کر ویٹر ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد مطلوبہ چیزیں میز پر تھیں۔ موصوف بسم اللہ پڑھے بغیر ندیدوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے آناً فاناً صاف کردیا۔

"آؤ وووووو ہائے ے ے ے وک!"

پانی پینے کے بعد حمید ڈھول نے انتہائی بھیانک قسم کی ڈکار لی۔ آس پاس بیٹھے لوگوں نے اس "عجوبہ" کو حیرت سے دیکھا اور پھر قہقہہ مار کر ہنسے۔ حمید ڈھول نے اس کا ذرہ برابر "اثر" نہ لیا وہ بھوکی چیل کی طرح ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا۔

ہم اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ اب صرف کولڈ رنک کا تقاضا کیا جائے گا۔ لیکن ہماری حیرت کی اس وقت انتہا نہ رہی جب انہوں نے ویٹر کو کال کر کے بڑے نخرے سے بریانی اور درجن بھر کوفتے لانے کا نیا آرڈر دیا۔ ہم نے ویٹر کو اشاروں میں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ کہہ دے کہ یہ چیزیں ختم ہوچکی ہیں۔ لیکن وہ ظالم بھی حمید ڈھول کے ساتھ ملا ہوا لگتا تھا۔ ہمارے سینے پر مونگ کی دھلی ہوئی دال دلتے ہوئے بولا "ابھی لایا صاحب!"

اور ہم ردعمل میں دانت پیس کر رہ گئے۔

کمزور آدمی کے پاس پینے کے لئے یہی تو اک چیز ہوتی ہے۔ دوسری چیزوں کو پینے کے قابل اس

کی جان کہاں!

ویٹر نے جیسے ہی "مال" میز پر رکھا انہوں نے ایک بار پھر جارحیت کی پالیسی کے تحت حملہ کردیا۔

میزان ایک سو پچاس تک پہنچ چکا تھا۔ اور ہمارے پاس صرف دو سو روپے تھے۔ حمید ڈھول کا مزید کچھ "نگلنے" کا ارادہ ہمارے لئے "وجہ رسوائی" بن سکتا تھا۔

"کھاؤ یار..... تم کس..... سوچ میں گم ہو..... کھاؤ پیو مزے اڑاؤ وو..... زندگی! اسی کا نام ہے!" وہ کھانے کے دوران پہلی بار ہماری جانب متوجہ ہوئے۔

"اگر آپ سے کچھ بچ گیا تو زہر مار کرلوں گا" ہمارے لہجہ میں طنز نمایاں تھا۔ ارے ناراض نہیں ہوتے..... تم یہ کھاؤ میں اور منگالیتا ہوں ....." "ویٹر..... ویٹر" انہوں نے بریانی کی کوارٹر پلیٹ اور ایک عدد کوفتہ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے' ویٹر کو آواز دی۔ اور ہمارا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

"جی صاحب!" ویٹر نے دور سے ہانک لگائی۔

"ایک بریانی.....اور"

"یار اب بس بھی کرو..... انگلی پکڑانے کا یہ مطلب نہیں کہ تم ہاتھ ہی پکڑ لو" ہم نے انہیں غیرت دلانی چاہی۔ لیکن انہیں غیرت آتی بھی تو کیسے؟ وہ بغیر کسی غیرت کے بریانی پر ٹوٹ پڑے۔ پانچ منٹ بعد بریانی "غائب" تھی۔

"صاحب اور کچھ؟" ویٹر نے پلیٹیں اٹھا کر ہماری طرف ڈھٹائی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"دو سیون اپ" حمید ڈھول نے توند پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے حکم جاری کیا

"دو نہیں..... صرف ایک" ہم نے فوراً ترمیم کی۔

"یار ایک سے میرا کیا بنے گا؟" موصوف منہ بسورتے ہوئے بولے۔

"اگر تم سے پہلے میرا "کچھ" "بن" گیا تو" ہم نے ان کو گھور کر کہا۔

"اچھا چلو ایک ہی سہی....." وہ ساری جاتی دیکھ کر فوراً" آدھی بانٹنے پر راضی ہوگئے۔

بوتل پینے کے بعد انہوں نے گلاس کے ذریعے دو گھونٹ برابر پانی خالی بوتل میں بھرا اور خوب ہلانے کے بعد پی گئے۔

اردگرد بیٹھے لوگ جو کافی دیر سے ان کے کھانے کے طریقے سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ اب پینے کے انداز پر قہقہے لگا رہے تھے لوگوں کے مذاق کی تاب نہ لاتے ہوئے ہم شرم سے پانی پانی ہونے لگے موٹے آدمی کی غیرت کو جاگنے میں وقت تو لگتا ہے۔ اور وہ وقت ابھی بہت دور تھا۔

بل دیکھ کر ہم دل ہی دل میں اللہ کا شکر بجائے لائے کہ اس نے آج ہمیں بھرے ریسٹورنٹ میں رسوا ہونے سے بچالیا تھا۔

بل ایک سو اٹھانوے روپے کا تھا۔ ہم نے دو سرخ نوٹ ٹرے میں رکھے اور خاموشی سے اٹھے حمید ڈھول کو ساتھ لئے ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے۔ ابھی چند فرلانگ ہی چلے تھے کہ حمید ڈھول کا چہرہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے لگا۔

"کیا ہوا؟" ان کی "فیس ریڈنگ" کرتے ہوئے ہمارے اندر کا ہمدرد انسان نہ چاہتے ہوئے بھی جاگ اٹھا۔

و ..... و ..... وہ ..... ہپ ..... ہپ .....

پیٹ ہائے ئے ئے ئے ..... پیٹ میں کچھ ..... ہورہا ہے!" انہوں نے توند کو دونوں ہاتھ سے سنبھالتے ہوئے پیٹ میں "کچھ" ہونے کی اطلاع دی۔

"یار ..... مم ..... مم ..... میرے پیٹ میں ..... کچھ ہے" وہ دوبارہ چیخے۔

"کچھ!" ہم نے کچھ پر زور دیتے ہوئے کہا "یار تمہارے منہ سے کچھ کا لفظ سنتے ہوئے کچھ عجیب سا محسوس ہورہا ہے ..... اس پیٹ میں اس وقت فرائی گوشت، درجن کباب ..... اتنی ساری روٹیاں ..... بریانی ..... کوفتے اور پھر بریانی اور پھر سیون اپ بمعہ گریبی موجود ہے اور تم کہہ رہے ہو صرف "کچھ" ہے!!"

میں کہہ رہا ہوں پیٹ میں کچھ ہے ..... اور ..... تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے ..... مجھے تمہارے اس رویہ سے شدید شاک پہنچا ہے"

وہ غصے اور تکلیف کے ملے جلے احساسات کے ساتھ منہ بسورتے ہوئے بولے۔

تم آج ہی پیٹ میں دو عدد شاک ابزرور لگوالو" اب جلتی پر تیل چھڑکنے کی ہماری باری تھی۔

"اف ..... اف ..... اف ف ف ف ..... ہائے ئے ئے ئے اوووووو ..... ہائے ئے ئے ئے" درد سے بلبلاتے ہوئے ان کی ہائے پر خاصا زور پڑتا تھا۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ آخری ہائے ہم پہ آپڑے۔ اور ہم ....." ہم اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکے اور فوراً" رکشہ روکا اور ڈرائیور کے تعاون سے ان کا جسد خاکی (بہ حالت زندہ) رکشے میں لادا اور خود ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئے ..... اور رکشہ فریاد کرتا ہوا منزل کی طرف بڑھنے لگا۔

اللہ اللہ کر کے منزل پر پہنچے۔ ان ہی کی جیب سے ڈرائیور کو اجرت ادا کی اور ہماری درخواست پر ڈرائیور نے ہمارے ساتھ ملکر انہیں عرش سے فرش پر اتارا۔ ہم "بیماری" کو لیے ان کے گھر میں داخل ہوئے۔

"ہائے کیا ہوگیا میرے چاند کو؟" ان کی امی جان موصوف کی حالت خراب دیکھ کر گھبرا گئیں۔

"کچھ نہیں ...... بس آج کچھ زیادہ چمک گیا ہے۔"

حرام خور کو میں نے لاکھ بار سمجھایا ہے کہ کم بخت مارے کم ٹھونسا کر...... کسی دن نظر لگ گئی تو مرجھا جائے گا۔ لیکن یہ نگوڑا مارا سنتا ہی کب ہے کسی کی!!" انہوں نے حمید ڈھول کو دوہتڑ جماتے ہوئے غصے کا عملی مظاہرہ پیش کیا۔ اور موصوف رد عمل میں منہ بسورنے لگے۔

"جا بیٹا! ...... دوڑ کر جا چوک والے حکیم جی سے ہاضمے کا چورن لے آ"

خالہ جان اب بالکل پریشان نہ ہوں میں ابھی انہیں ٹھیک کر کے لاتا ہوں۔" ہم نے لفظ ٹھیک پر زور دیتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ ان کی امی کچھ کہتیں ہم نے حمید ڈھول کو بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا اور ساتھ لئے گھر سے باہر نکل آئے۔

☆ --- ☆ --- ☆

"تم یہاں لیٹ جاؤ ...... میں دس منٹ میں آیا" ہم نے انہیں پارک میں بینچ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"ذرا جلدی آجانا ...... پیٹ میں بہت درد ہورہا ہے" انہوں نے روہانسے انداز میں ہمیں تاکید کی۔

"بس یوں گیا اور ...... یوں آیا" ہم نے چٹکی بجاتے ہوئے انہیں تسلی دی۔ بھاگم بھاگ گھر پہنچے ...... ٹامی کو ساتھ لیا اور واپس پارک میں رپورٹ کی۔ دیکھا تو موصوف "قیلولہ" فرمارہے تھے اور وہ بھی کرکٹ کی پچ پر!

ہم نے "ٹارگٹ" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ٹامی کی زنجیر کھول دی۔ ادھر ٹامی ٹارگٹ کی طرف دوڑا ادھر ہم "سین" دیکھنے کے لئے درخت کے پیچھے جا چھپے۔

ٹامی نے انہیں قریب جا کر سونگھا اور پھر زور سے بھونک کر ان کے زندہ ہونے کا "تصدیقی سنگل" دیا۔ حمید ڈھول نے ہنگامی طور پر قیلولہ موقوف کرتے ہوئے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔

ایک خوفناک کتے کو سر پر موجود پاکر بھیانک چیخ ماری اور توند کو سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بچاؤ ؤؤؤؤؤؤ بب .... بب .... بچاؤ ؤؤؤؤ .... خخ .... خخ .... خدا کے لئے .... مجھے بچاؤ" انہوں نے چیخ کر مدد طلب کی اور پھر خوفزدہ انداز میں دوڑنے لگے۔ ٹامی مسلسل ان کے تعاقب میں تھا۔

ٹامی اور حمید ڈھول کی یہ دوڑ اتنی دلچسپ تھی کہ ہمارا دو سو روپیہ کا صدمہ ایک پل میں ختم ہوگیا۔

ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہمیں یقین تھا کہ دو بلائیں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ ٹامی کے ہوتے ہوئے پیٹ درد کی کیا مجال تھی کہ ہمارے "یار" حمید ڈھول کو تنگ کرتا۔

UHU انعامی مقابلہ نمبر۲ کے نتائج

جوابات

۱۔ سبز ۲۔ سنہ ۲ ہجری ۳۔ گلا نہ تھا ۴۔ یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے ۵۔ حسین شاہ، کانسی۔

انعامی رقم حاصل کرنے والے خوش نصیب انعام یافتگان

۱۔ ریحان احمد (کراچی) پہلا انعام ۔۲۰۰۰ روپے نقد
۲۔ حمیرا زیب (راولپنڈی) دوسرا انعام ۔۱۰۰۰ روپے نقد
۳۔ یاسمین غوری (کراچی)۔ تیسرا انعام۔ ۵۰۰ روپے

(T-Shirt) جیتنے والے خوش نصیب انعام یافتگان۔

بینہ سلیم، کراچی۔ محسن اعجاز، گجرانوالہ۔ کرن نعیم، کراچی۔ فیضان سرمد، کراچی۔ بشریٰ خانم، لطیف آباد۔ محمد اقبال بھٹی، بھکر۔ ارشاد احمد، کراچی۔ عدنان احمد، کراچی۔ سید بشارت علی، کراچی۔ سعدیہ ارم، کراچی۔ بلال مسعود، کراچی۔ لبنیٰ غزل، کراچی۔ سحر مختار، کراچی۔ محمد نعمان شیخ، کراچی۔ مبشر مہتاب، اسلام آباد۔ رفعت انجم، کراچی۔ نامعلوم، رفاہ عام کراچی۔ کرن مختار، کراچی۔ نورین نعیم، کراچی۔ ماریہ طیب، لاہور۔ محمد اویس خان، میانوالی۔ اسماء صدیقی قریشی، اٹک۔ اسماعیل گابا، کراچی۔ شاہد حسین، کراچی۔ زرینہ عسکری، میانوالی۔ محمد حیات خان نیازی، راولپنڈی۔ ثمر مختار، کراچی۔ سید حیدر عباس، اسلام آباد۔

کراچی کے ٹی شرٹ کے انعام یافتگان دفتر آنکھ مچولی سے اپنا انعام حاصل کرلیں۔ بیرون کراچی کو انعامات بذریعہ ایئر سروس روانہ کردیئے جائیں گے۔

عبدالباسط

آج سے تقریباً" نوے برس پہلے کا ذکر ہے کہ لندن کے مضافات کی گلیوں میں کچھ لڑکے کھیل رہے تھے۔ایک بڑے لڑکے نے ایک چھوٹے لڑکے کو اٹھایا اور اوپر ہوا میں پھینک دیا۔ جب وہ لڑکا نیچے آیا تو بڑے لڑکے نے اسے اپنے ہاتھوں پر کیچ کرنا چاہا۔ لیکن وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا اور اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔

یہ بچہ مستقبل میں ایک مشہور مصنّف بنا۔ اس بچے کا نام برٹی ویلز تھا۔ لیکن اکثر لوگ اسے برٹی کے نام سے نہیں بلکہ "ہربرٹ جارج ویلز" یا "ایچ۔جی ویلز" کے نام سے جانتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ میں سے بعض ساتھیوں نے اس کی کچھ کتابیں بھی پڑھ رکھی ہوں۔ اس نے پچھتر سے زائد کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن ایک بہت بڑے مصنّف کی حیثیت اختیار کرنے تک اس

نے جو کچھ کیا وہ بہت دل چسپ ہے اور دل چسپ ہی نہیں عزم و حوصلہ کا ایک بہترین سبق بھی ہے۔

ٹانگ ٹوٹنے کے باعث ننھا برٹی ایک مسلسل عذاب کے عالم میں اپنے بستر پر لیٹا رہا۔ چند ماہ بعد جب ٹانگ کا معائنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ٹانگ کی ٹوٹی ہوئی ہڈی اپنی جگہ پر صحیح طور سے جڑی نہیں۔ لہٰذا ہڈی کو دوبارہ ہلا دیا گیا۔ ننھا برٹی اس تکلیف سے کئی روز تک نڈھال رہا۔ اس وقت یہ بات برٹی کے لئے کسی المیہ سے کم نہ تھی۔ لیکن بعد میں اسی المیہ کے باعث اس کا شمار دنیا کے مشہور ترین مصنفوں میں ہونے لگا۔ یہ بات خود اس نے بھی تسلیم کی کہ اس کی ٹانگ ٹوٹنا اس کی زندگی کا سب سے اچھا حادثہ ثابت ہوا۔

ٹانگ ٹوٹنے کی وجہ سے وہ ایک سال تک گھر سے باہر نہ نکل سکا۔ شروع شروع میں تو وہ ہر وقت بستر پر لیٹے رہنے سے اکتا گیا۔ لیکن پھر اس نے اپنی بوریت کا یہ حل نکالا کہ اس نے کتابیں پڑھنا شروع کر دیں۔ اس کے ہاتھ میں جو کتاب بھی آئی اس نے پڑھ ڈالی۔ کیونکہ اس کے علاوہ اسے کوئی کام نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے اندر مطالعے کا شوق پیدا ہو گیا۔ اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ زندگی میں نام پیدا کر کے رہے گا۔

ٹوٹی ہوئی ٹانگ اس کی زندگی میں کایا پلٹ ثابت ہوئی۔ ایچ۔ جی۔ ویلز کا شمار ان مصنفین میں ہوتا ہے جو اپنی نگارشات کا سب سے زیادہ معاوضہ لیتے تھے۔ اس نے اپنے قلم کے زور پر تقریباً" دو لاکھ پونڈ کمائے۔ لیکن اس کا بچپن بے حد مفلسی میں گزرا تھا۔ اس کا باپ کرکٹ کا پیشہ ور کھلاڑی تھا۔ اور ساتھ ہی کراکری کی ایک دکان بھی چلاتا تھا۔ لیکن اس دکان سے اسے کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا۔ ایچ۔ جی۔ ویلز بھی اسی دکان کے ایک چھوٹے سے کمرے میں پیدا ہوا۔ اس کا کچن دوکان کے نیچے ایک تہہ خانے میں تھا وہ تہہ خانہ تاریک اور سیل زدہ تھا اور اس کے اندر روشنی کا ذریعہ فقط ایک روشندان تھا جو باہر فٹ پاتھ پر کھلتا تھا۔ گھر کی حالت روز بروز پتلی ہونے لگی تو فاقوں سے بچنے کے لئے ایچ۔ جی۔ ویلز کو ملازمت کرنا پڑی۔ سب سے پہلے وہ ایک درزی کے پاس ملازم ہوا۔ یہاں پر اسے کڑی مشقت برداشت کرنا پڑتی۔ وہ صبح سویرے اٹھ کر دوکان صاف کرتا' پھر وہ آگ جلاتا اور پھر چودہ گھنٹے دوکان پر کام کرتا۔ یہ کام اس کے لئے کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ ایک مہینے کے بعد دوکان

کے مالک نے اسے تھپڑ مارے اور اس کی سستی کے باعث اسے ملازمت سے برخواست کر دیا۔

پھر اسے ایک کیمسٹ کی دوکان پر ملازمت ملی۔ لیکن وہاں سے بھی ایک ماہ بعد نکال دیا گیا۔ اس کے بعد اسے ایک دوسرے درزی کی دوکان پر ملازمت مل گئی۔ اس دوکان پر اس نے قدرے جم کر کام کیا۔ لیکن جب کبھی بھی اسے موقع ملتا وہ چوری چھپے کتابوں کا مطالعہ کرنا شروع کر دیتا۔

دو سال تک اس نے وہاں ملازمت کی۔ لیکن اس طرح کی ملازمتیں اس کی قوتِ برداشت سے باہر تھیں۔ آخر کار ایک صبح وہ اٹھا تو اس نے اپنی ماں سے اس کے متعلق بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ماں کو دیکھتے ہی وہ زار و قطار رونے لگا اس نے قسم کھا کر ماں سے کہہ دیا کہ وہ اس قسم کی ملازمتیں کرنے کے بجائے خود کو ہلاک کر لے گا۔

پھر اس نے ایک بڑا رقت آمیز خط اپنے اسکول ماسٹر کو لکھا۔ ویلز نے اسے اپنی تمام تکلیفوں سے آگاہ کیا اور آخر میں لکھا کہ وہ زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ اسے یقین تھا کہ اس خط کا جواب نہیں آئے گا۔ لیکن کچھ دنوں بعد جب خط کا جواب آگیا تو اسے بے حد حیرت ہوئی۔ اس کے استاد نے اسے اپنے اسکول میں ملازمت کی پیش کش کی تھی۔

یہ اس کی زندگی کا دوسرا کایا پلٹ واقعہ تھا۔ اسکول کی ملازمت کرتے ہوئے ابھی چند ہی برس ہوئے تھے کہ ایک ناگہانی آفت نے اسے آلیا۔ ہوا یہ کہ فٹ بال کھیلتے ہوئے وہ اس بری طرح گرا کہ اس کا ایک گردہ پھٹ گیا۔ اور داہنے پھیپھڑے میں سوراخ ہو گیا۔ اس میں سے خون بری طرح بہہ رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے اس کی حالت دیکھ کر جواب دے دیا۔ کئی مہینے تک وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار رہا۔ پھر معجزانہ طور پر اس کی حالت بہتر ہونے لگی۔ اس کے باوجود اس نے بارہ برس تک اپاہجوں کی سی زندگی گزاری۔ اس دوران اس نے وہ کتابیں لکھنا شروع کیں جن کی بدولت وہ مہذب دنیا میں نامور ہوا۔

پانچ برس تک اس نے بہت کچھ لکھا۔ لیکن جس ناشر کے پاس بھی وہ گیا اس نے اسے شائع کرنے سے انکار کر دیا۔ ایک ناشر نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ان کتابوں کو جلا دے۔ اور پھر نئے سرے سے لکھے۔ ایچ۔ جی۔ ویلز نے اس کے مشورہ کے مطابق اپنی پانچ سال کی محنت کو جلا دیا۔

یہ ساٹھ برس پہلے کی بات ہے۔ ایچ۔ جی۔ ویلز کی صحت روز بروز بہتر ہونے لگی۔ انجام کار وہ انسانی طاقت کا ایک زبردست ذخیرہ ثابت ہوا۔ ہر سال وہ دو ضخیم کتابیں لکھتا۔ ایسی کتابیں جو ساری علمی دنیا میں ارتعاش پیدا کر دیتیں۔

ویلز کا ذہن ہر وقت خیالات سے روشن رہتا تھا۔ وہ رات کو اٹھ اٹھ کر اپنے خیالات نوٹ بک میں لکھتا تھا۔ یہ وہی ست لڑکا تھا جسے ایک درزی نے اس کی سستی کی بناء پر دوکان سے نکال دیا تھا۔ اسی لڑکے نے اپنی نوٹ بک میں اتنے خیالات جمع کر رکھے تھے کہ اگر وہ ڈیڑھ سو برس بھی لکھتا تو ختم نہ ہوتے۔

کیا آپ ناراض ہیں؟

اگر آپ

- اس لئے ناراض ہیں کہ آنکھ مچولی میں بھیجی ہوئی تحریر شائع نہیں ہوئی تو ذرا سوچیے کہ ایسا کیوں ہوا؟
- کیا آپ کی تحریر نقل شدہ تھی۔؟
- پہلے شائع ہو چکی تھی؟
- صفحے کے دونوں طرف اور لائن چھوڑے بغیر لکھی گئی تھی۔
- پنسل سے یا اتنے مشکل رسم الخط میں لکھی گئی تھی کہ پڑھی نہیں جا رہی تھی؟
- چھوٹے پرزوں پر لکھی گئی تھی؟
- ایک ہی صفحے پر بہت سی تحریریں لکھی گئی تھیں؟
- آپ کی تحریر کا انداز بیان، خیال اور اسلوب بچوں کی نفسیات سے ہٹ کر تھا؟
- آپ کی تحریر مشکل اور گنجلک تھی؟
- آپ کی تحریر میں مقصدیت کا فقدان تھا۔؟
- تو پھر سوچیے کہ آپ کی تحریر کیونکر شائع ہو سکتی تھی۔
- اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی تحریر شائع ہو تو اوپر بیان کی گئی تمام باتوں سے بچیں۔
- یاد رکھیے! بڑا ادیب بننے کے لئے مطالعہ اور مسلسل محنت بہت ضروری ہے۔

(ادارہ)

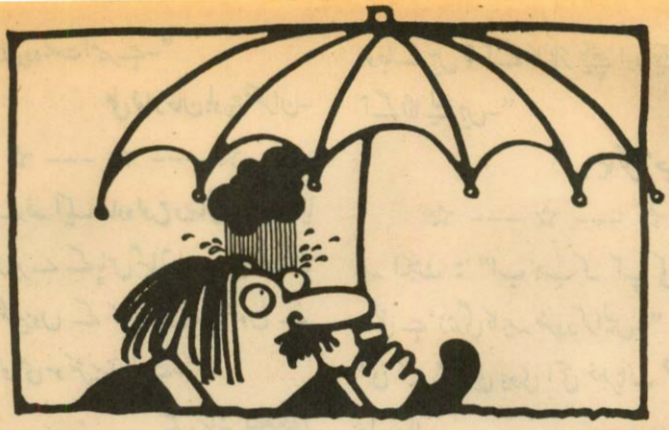

لطیفے شطیفے

تین بچے اپنی امی کے بالوں کی تعریف کر رہے تھے۔

پہلا : "میری امی کے بال اتنے لمبے ہیں کہ زمین کو چھوتے ہیں۔"

دوسرا : "میرے امی کے بال اتنے سنہرے ہیں جتنا سونا۔"

تیسرا : "میری امی کے بال تو جادو کے ہیں کبھی میز پر ہوتے ہیں اور کبھی ان کے سر پر۔"

عادل خان، محلہ بونکہ، سرحد

☆ --- ☆ --- ☆

بیوی : (شوہر سے) "تم نے خواہ مخواہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر اپنے دوست کی جان بچائی۔"

شوہر : "کیا کرتا کمبخت نے میرا سوٹ جو پہن رکھا تھا۔"

☆ --- ☆ --- ☆

ایک آدمی : (دوسرے سے) "یار میرا ایک دوست بالکل عجیب و امیر ہے۔"

دوسرا آدمی : "تم غلط بول رہے ہو صحیح لفظ عجیب و غریب ہوتا ہے۔"

پہلا آدمی : "میرا دوست عجیب تو ہے لیکن

غریب نہیں وہ بہت امیر ہے۔"

علی نواز خان بلوچ، مکران۔

☆ --- ☆ --- ☆

ایک دفعہ ایک سادہ لوح دیہاتی چڑیا گھر گیا جب وہ زیبرے کے پاس گیا تو اسے دیکھ کر کہنے لگا۔ "انگریزوں کے کام تو دیکھو انہوں نے گدھے کو بھی سوئٹر پہنا دیا ہے۔"

عقیل شانہ، پنجگور

☆ --- ☆ --- ☆

دو دوست دریا کے کنارے سیر کر رہے تھے کہ اچانک ایک فقیر نے صدا لگائی "اللہ کے نام دے جا بابا۔" ایک دوست نے فقیر کو ایک روپیہ دیا اور ساتھ ہی دریا میں دھکا دے دیا۔ پہلے دوست نے حیران ہو کر اس کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا "نیکی کر دریا میں ڈال۔"

☆ --- ☆ --- ☆

عقیل، پنجگور

☆ --- ☆ --- ☆

دو لڑکیاں ایک سڑک کے کنارے گاڑی کا ٹائر بدل رہی تھیں۔ ایک لڑکے نے قریب آکر پوچھا۔

"میڈم! کیا پنکچر ہو گیا ہے؟"

ایک لڑکی نے جواب دیا "جی نہیں .... جب بور ہو جاتے ہیں تو آگے کا ٹائر پیچھے اور پیچھے کا ٹائر آگے لگا لیتے ہیں۔"

نیما گل، حیدر آباد۔

☆ --- ☆ --- ☆

بیمہ ایجنٹ : "اب جب کہ آپ کی شادی ہو گئی ہے، زندگی کا بیمہ ضرور کرالیں۔"

"جی نہیں، میری بیوی اتنی خطرناک نہیں۔" جواب ملا۔

شیر نواز پشاور

☆ --- ☆ --- ☆

ایک آدمی نجومی کے پاس گیا اور کہا :

"میری ہتھیلی میں کھجلی ہو رہی ہے۔"

نجومی : "تم کو جلد ہی دولت ملنے والی ہے۔"

آدمی : "میرے پاؤں میں بھی کھجلی ہو رہی ہے۔"

نجومی : "تم سفر بھی کرو گے۔"

آدمی : "میرے سر میں بھی کھجلی ہو رہی ہے۔"

نجومی : "چلو بھاگو یہاں سے تمہیں تو خارش کی بیماری معلوم ہوتی ہے۔"

مرسلہ : میمونہ صدف، رحیم یار خان۔

☆ --- ☆ --- ☆

ڈاکٹروں کی کانفرنس میں ایک ڈاکٹر بڑھ چڑھ

کر تقریر کر رہے تھے۔ ہال میں سے کسی نے پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب کیا آپ حیوانوں کے ڈاکٹر ہیں؟" تو ڈاکٹر نے جواب دیا "جی ہاں آپ کو کیا بیماری لاحق ہے؟"

قیصر نوید، ضلع اٹک

☆ --- ☆ --- ☆

استاد (عادل سے) "تم اسکول روزانہ کیوں نہیں آتے؟"

عادل : "جناب میرے ابو کہتے ہیں کہ روزانہ ایک ہی جگہ جانے سے عزت نہیں رہتی۔"

محمد عمر قریشی، اسلام آباد۔

☆ --- ☆ --- ☆

ایک شخص نے اپنے والدین کو خط میں لکھا کہ "میری فیملی کو لندن بھیج دیں۔" والدین ان پڑھ تھے۔ انہیں فیملی کا مطلب معلوم نہیں تھا۔ کسی نے مذاق میں کہہ دیا کہ فیملی رضائی کو کہتے ہیں۔ اس پر باپ نے اپنے بیٹے کو لکھا۔ "بیٹا! تمہاری فیملی کو چوہے کھا گئے ہیں۔ تم وہاں اپنی نئی فیملی بنالو۔"

محمد عمر قریشی، اسلام آباد۔

☆ --- ☆ --- ☆

ایک شخص نے تصویروں کی نمائش میں ایک نہایت ہی خوبصورت تصویر دیکھی جو کسی بزرگ کی تھی اس نے آرٹ گیلری کے مینجر سے قیمت پوچھی جواب ملا۔

"پچاس روپے۔"

اس شخص کے پاس کُل بیالیس روپے تھے اس نے آٹھ روپے کم کرنے پر بڑا اصرار کیا لیکن مینجر نہ مانا۔ آخرکار وہ شخص افسوس سے ہاتھ ملتا ہوا چلا گیا۔ چند روز بعد وہ اپنے ایک دوست کے گھر گیا تو وہی تصویر ڈرائنگ روم کی دیوار پر لٹک رہی تھی۔ اس نے دوست سے فوراً پوچھا۔

"یہ بتاؤ یہ تصویر کس کی ہے؟"

دوست بولا۔

"میرے پردادا کی ہے۔"

پہلے شخص نے کہا "افسوس اس روز آٹھ روپے کم تھے ورنہ یہ میرے پردادا ہوتے۔"

نعمان عزیز، سعود آباد ملیر کالونی، کراچی۔

☆ --- ☆ --- ☆

سلیمہ (باپ سے) "ابا جی! آٹا ختم ہو گیا ہے، روٹی کیسے پکاؤں؟"

ابا جی (بے خیالی میں) : "تو بیٹی پراٹھے بنالو۔"

☆ --- ☆ --- ☆

جج : "ایک چوری کے بعد تو نے دوسری چوری کیوں کی؟"

ملزم : "جناب کیا کرتا۔ وکیل کی فیس کہاں سے ادا کرتا؟"

☆ --- ☆ --- ☆

استاد : "لڑکو! آریہ لوگوں نے دنیا میں کیا چیز اپنی چھوڑی؟"

ایک لڑکا : "جناب ہڈیاں"

فوزیہ علوی، پٹارو۔

☆ --- ☆ --- ☆

ایک فرم نے ڈرائیور کی اسامی کے لئے اشتہار دیا فرم کی طرف سے سب کو ایک چھپا ہوا فارم دیا گیا جو امیدواروں کو پُر کرنا تھا۔ ایک کالم میں سوال تھا۔

"کیا تم کبھی گرفتار ہوئے ہو؟"

ایک ڈرائیور نے لکھا "نہیں"

دوسرا سوال تھا "اگر کبھی گرفتار نہیں ہوئے تو کیوں؟"

اس نے جواب میں لکھا "کبھی موقع پر پکڑا ہی نہیں گیا۔"

کاشف مرزا، گلستان کالونی بورے والا۔

☆ --- ☆ --- ☆

محکمہ ٹیلیفون کے ڈائریکٹر نے فون پر ایک شخص کو اطلاع دیتے ہوئے کہا "محکمے کو اس بات کا افسوس ہے کہ کل آپ نے ہمارے آپریٹر سے سخت بد کلامی کی۔ اگر آپ معذرت نہیں کریں گے تو آپ کا فون کاٹ دیا جائے گا۔" اس پر اس شخص نے معذرت کرنے کی حامی بھرلی اور آپریٹر سے کہا : "کل میں نے آپ سے یہی کہا تھا نا کہ آپ جہنم میں جائیں۔"

"جی ہاں" آپریٹر نے جواب دیا۔

"اچھا تو اب میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ آپ جہنم میں نہ جائیں۔"

شکیب صدیقی، کراچی۔

☆ --- ☆ --- ☆

دو دوست ایک گھر کے سامنے سے گزرے۔

ایک دوست نے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ اس گھر میں بھوت رہتے ہیں؟"

دوسرے نے کہا۔ "چلو دیکھ لیتے ہیں۔"

دروازہ کھٹکھٹایا گیا تو ایک آدمی نمودار ہوا۔ ان میں سے ایک نے پوچھا۔ "میں نے سنا ہے یہاں بھوت رہتے ہیں۔"

اس آدمی نے جواب دیا۔ "مجھے کیا معلوم مجھے تو مرے ہوئے خود دس سال ہوگئے ہیں۔"

عبدالقدیر فراز، عیسیٰ پنگوری

اولمپک ہاکی کا نیا چیمپئن

واجد رضا اصفہانی

براعظم یورپ کا ترقی یافتہ ملک ہالینڈ اٹلانٹا اولمپک میں ہاکی کا نیا اولمپک چیمپئن بن کر سامنے آیا۔ 14192 مربع میل پر پھیلے اس ملک نے اولمپک ہاکی کے فائنل میں اسپین کی ٹیم کو 3-1 سے شکست دے کر پہلی دفعہ اولمپک کا ہاکی ٹائٹل حاصل کیا۔ ہالینڈ نے اس سے قبل 12 اولمپک ہاکی مقابلوں میں شرکت کی تھی۔ جس میں تین دفعہ تیسری اور دو دفعہ دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ پاکستان کی ہاکی ٹیم نے اس ٹورنامنٹ میں بدترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چھٹی پوزیشن حاصل کی۔

آیئے پاکستان کی ہاکی ٹیم اور اولمپک مقابلوں میں ہاکی ٹورنامنٹ کے مجموعی ریکارڈ کا مختصراً سا جائزہ لیں۔

"پاکستانی ریکارڈز"

1948ء سے 1996ء تک کھیلے گئے 13 اولمپک مقابلوں میں 12 میں پاکستانی ٹیم نے شرکت کی 1980ء کے ماسکو اولمپک کا پاکستان نے بائیکاٹ کیا تھا۔ 1960ء کے روم اولمپک میں پاکستانی ٹیم نے جاپان کو 10-0 سے شکست دے کر سب سے زیادہ گول اسکور کرنے کا پاکستانی ریکارڈ قائم کیا۔ کسی ایک اولمپک ہاکی مقابلوں میں سب سے زیادہ گول اسکور کرنے والے پاکستانی کھلاڑی عبدالعزیز ملک 1948ء اور حسن سردار 1984ء ہیں۔ دونوں نے دس دس گول اسکور کئے تھے۔ جبکہ اولمپک مقابلوں میں مجموعی طور پر سب سے زیادہ گول اسکور کرنے والے پاکستانی کھلاڑی رائٹ ان عبدالحمید حمیدی ہیں۔ جنہوں نے 1948ء میں 2 گول، 1952ء میں 3 گول، 1956ء میں 3 گول اور 1960ء میں 9 گول کئے۔

یوں کل ملا کر انہوں نے 17 گول اسکور کئے۔ پاکستان کی جانب سے چار اولمپک مقابلوں میں شرکت سب سے زیادہ تین کھلاڑیوں (عبدالحمید حمیدی' (60'56'52'1948) (منظور حسین عاطف (64'، 60'، 56'، 1952) اور (حبیب علی کڈی (64'60'56'1952) نے کی ہے۔ 1948ء سے 1996ء تک پاکستان نے اولمپک میں 19 ٹیموں کے خلاف 79 میچز کھیلے ہیں جن میں 56 جیتے' 15 ہارے اور 8 برابر رہے۔ کل 222 گول کئے اور اس کے خلاف 83 گول اسکور ہوئے۔

مجموعی ریکارڈز

1896ء سے 1996ء تک کھیلے گئے 123 اولمپک گیمز میں سے 18 مرتبہ ہاکی کا کھیل شامل رہا ہے۔ ان 18 مقابلوں میں پانچ دفعہ بھارت' تین تین دفعہ متحدہ ہندوستان' پاکستان اور انگلینڈ' دو دفعہ جرمنی اور ایک ایک مرتبہ نیوزی لینڈ اور ہالینڈ کی ٹیمیں یہ اعزاز حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکی ہیں۔ 1908ء کے لندن اولمپک میں کل 34 گول اسکور ہوئے جو کسی بھی اولمپک مقابلوں میں کی گئی گولوں کی کم سے کم تعداد ہے۔ 1932ء کے لاس اینجلز اولمپک میں صرف تین ٹیموں نے شرکت کی جو اولمپک مقابلوں میں کم سے کم ہاکی ٹیموں کی شرکت کا ریکارڈ ہے۔ جبکہ سب سے زیادہ 1960ء کے روم' 1968ء کے میکسیکو اور 1972ء کے میونخ اولمپک میں 16 ٹیموں نے شرکت کی۔ سب سے زیادہ گول 1972ء کے میونخ اولمپک میں ہوئے جن کی تعداد 199 ہے۔ اولمپک کے ایک ہاکی میچ میں سب سے زیادہ گول متحدہ ہندوستان کی ٹیم نے کئے ہیں۔ اس نے 1932ء کے لاس اینجلز اولمپک میں امریکہ کی ٹیم پر 24 گول کئے جو ایک ریکارڈ ہے۔ متحدہ ہندوستان کی ٹیم پر امریکہ نے ایک گول بھی کیا تھا۔ جبکہ اسی میچ میں متحدہ ہندوستان کے روپ سنگھ نے جو دھیان سنگھ چند کے بھائی تھے۔ کل 12 گول اسکور کئے۔ جو اولمپک ہاکی مقابلوں میں ایک میچ میں سب سے زیادہ گول کرنے کا انفرادی ریکارڈ ہے۔ ایک ٹورنامنٹ میں سب سے زیادہ گول اسکور کرنے والی ٹیم بھارت کی ہے جس نے 1980ء کے ماسکو اولمپک میں کل 42 گول اسکور کئے اور اس کے خلاف 8 گول اسکور ہوئے۔ اولمپک ہاکی چیمپئن شپ کے بہترین گول کیپر کا اعزاز بھارتی گول کیپر شنکر لکشمن کو حاصل ہے۔ جس کی ٹیم نے 1956ء کے میلبورن اولمپک میں کل 38 گول اسکور کئے اور اس پر ایک گول بھی نہیں ہوا۔

اولمپک ہاکی مقابلوں کا پہلا میچ 1908ء کے لندن اولمپک میں اسکاٹ لینڈ اور جرمنی کی ٹیموں کے درمیان کھیلا گیا جس میں اسکاٹ لینڈ نے جرمنی کو 4-0 سے شکست دی۔ اس میچ میں اسکاٹ لینڈ کے "آئن لنگ" نے جرمنی کے خلاف گول اسکور کر کے اولمپک کی تاریخ کے پہلے اسکورر ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔

اولمپک ہاکی کا سب سے طویل دورانیہ کا میچ میکسیکو اولمپک گیمز 1968ء میں ہالینڈ اور اسپین کے درمیان 145 منٹ تک کھیلا گیا تھا۔ جس میں ہالینڈ نے اسپین کو 1-0 سے شکست دی۔

اب تک کھیلے گئے 18 اولمپک ہاکی مقابلوں میں کل 38 ملکوں نے شرکت کی ہے جن کے درمیان مجموعی طور پر 502 میچز کھیلے گئے اور کل 2040 گول اسکور ہوئے۔

پاکستانی ریکارڈز

اولمپک	مقام	کپتان	میچ کھیلے	جیتے	ہارے	برابر رہے	گول کئے	گول ہوئے	پوزیشن
1948ء	لندن	علی اقتدار شاہ دارا	7	4	2	1	22	10	چوتھی
1952ء	ہلسینکی	نیاز خان	3	1	2	0	7	2	چوتھی
1956ء	میلبورن	عبدالحمید حمیدی	5	3	1	1	10	4	دوسری
1960ء	روم	عبدالحمید حمیدی	6	6	0	0	25	1	پہلی
1964ء	ٹوکیو	منظور عاطف	8	7	1	0	20	4	دوسری
1968ء	میکسیکو	طارق عزیز	9	9	0	0	26	6	پہلی
1972ء	میونخ	اسد ملک	9	6	2	1	19	7	دوسری
1976ء	مانٹریال	رشید جونیئر	6	4	1	1	20	10	تیسری
1984ء	لاس انجلز	منظور جونیئر	7	4	0	3	19	8	پہلی
1988ء	سیئول	ناصر علی	5	3	2	0	15	8	پانچویں
1992ء	بارسلونا	شہباز سینئر	7	6	1	0	25	11	تیسری
1996ء	اٹلانٹا	منصور احمد	7	3	3	1	14	12	چھٹی

اولمپک ہاکی ریکارڈز

اولمپک	مقام	اول	دوئم	سوئم	فائنل نتیجہ	میچ	گول	ٹیمیں
1908ء	لندن	انگلینڈ	آئرلینڈ	*	8-1	5	34	6
1920ء	اینٹورپ	انگلینڈ	ڈنمارک	بیلجیئم	*	6	42	4
1928ء	ایمسٹرڈیم	برطانوی ہند	ہالینڈ	جرمنی	*	18	69	9
1932ء	لاس اینجلز	برطانوی ہند	جاپان	امریکہ	*	3	52	3
1936ء	برلن	برطانوی ہند	جرمنی	ہالینڈ	8-1	19	110	11
1948ء	لندن	بھارت	انگلینڈ	ہالینڈ	4-0	27	117	13
1952ء	ہلسینکی	بھارت	ہالینڈ	انگلینڈ	6-1	12	50	12
1956ء	میلبورن	بھارت	پاکستان	جرمنی	1-0	22		12
1960ء	روم	پاکستان	بھارت	اسپین	1-0	32	117	16
1964ء	ٹوکیو	بھارت	پاکستان	آسٹریلیا	1-0	53	166	15
1968ء	میکسیکو	پاکستان	آسٹریلیا	بھارت	2-1	61	164	16
1972ء	میونخ	جرمنی	پاکستان	بھارت	1-0	60	199	16
1976ء	مانٹریال	نیوزی لینڈ	آسٹریلیا	پاکستان	1-0	29	110	11
1980ء	ماسکو	بھارت	اسپین	روس	4-3	17	139	6
1984ء	لاس اینجلز	پاکستان	جرمنی	انگلینڈ	2-1	34	138	12
1988ء	سیئول	انگلینڈ	جرمنی	ہالینڈ	3-1	34	127	12
1992ء	بارسلونا	جرمنی	آسٹریلیا	پاکستان	2-1	34		12
1996ء	اٹلانٹا	ہالینڈ	اسپین	آسٹریلیا	3-1	37	152	12

☆ تیسری پوزیشن کا میچ نہیں کھیلا گیا۔

☆ فائنل میچ نہیں کھیلا گیا۔

عقیلہ رشید

آنکھوں سے آنکھ مچولی تک

ہم مطالعہ کرنے کے بہت شوقین واقع ہوئے ہیں۔ اب تک نجانے کتنی کتابیں پڑھ چکے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ہمیں کچھ ایسی کتابیں بھی پڑھنے کو ملیں جو ہپناٹزم اور ٹیلی پیتھی وغیرہ کے متعلق تھیں۔ ان کتابوں میں ایسے طریقے بتائے گئے تھے جن کی مدد سے ہپناٹزم سیکھا جاسکتا ہے اور یہ بھی کہ ہپناٹزم سے کون کون سے کارنامے سرانجام دیے جاسکتے ہیں؛ یہ کارنامے ایسے زبردست تھے کہ ہم دن رات ہپناٹزم سیکھنے کی کوششوں میں لگ گئے۔ اس کے لئے ہمیں کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑے۔ یہ الگ داستان ہے کتنے ہی الٹے سیدھے عمل کئے۔ کتنے ہی لطیفے وجود میں آئے لیکن آخر کار ہماری کوششیں رنگ لے ہی آئیں اور ہم ہپناٹزم سیکھنے میں کامیاب ہوگئے۔ اب ہم اپنے ذہن میں منصوبے بنانے لگے کہ ہپناٹزم کی مدد سے ہمیں کون کون سے معرکے

سرانجام دینے ہیں؟

سب سے پہلا جو منصوبہ ہمارے ذہن میں آیا وہ نہایت ہی مزیدار قسم کا تھا اور ہماری زندگی میں بنیادی اہمت رکھتا تھا۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے ہمارے سالانہ امتحان ختم ہوئے تھے اور ہمیں اسکول سے چھٹیاں ملی تھیں۔ ہماری کلاس ٹیچر ہمارے گھر کے قریب ہی رہتی تھیں۔ ہم پہلے بھی امی کے ہمراہ ایک دو دفعہ ان کے گھر جا چکے تھے۔ ہم نے امی سے اجازت لی اور ان کے گھر پہنچ گئے۔ انہوں نے ہمیں اندر بلالیا اور پوچھا کہ "کیا کام ہے؟" ہم مس کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگے۔چونکہ ہم پہلی دفعہ کسی کو ہپناٹائز کررہے تھے اس لئے دل میں ڈر بھی تھا کہ کہیں ناکام نہ ہوجائیں۔ بہرحال ہم نے کسی نہ کسی طرح انہیں ہپناٹائز کر ہی لیا اور انہیں ہدایت جاری کی کہ جب وہ رزلٹ تیار کریں گی تو فرسٹ پوزیشن ہماری ہوگی۔ اس کے بعد ہم گھر آگئے اور نتیجے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ نتیجہ امتحان کا بھی تھا اور ہمارے پہلے تجربے کا بھی۔

خدا خدا کرکے نتیجہ نکلا۔ نتیجہ کیا نکلا ہماری لاٹری نکل آئی۔ ہماری فرسٹ پوزیشن آگئی تھی۔ ہم خوشی خوشی گھر آئے اور ابو کو رزلٹ کارڈ دکھایا۔ ابو کی نظر کچھ کمزور ہے ابو نے جب ہمارا رزلٹ کارڈ دیکھا تو اس وقت عینک نہیں لگائی ہوئی تھی۔ رزلٹ کارڈ دیکھ کر انہیں یقین نہ آیا۔کیونکہ ہمارا شمار ایک طویل عرصے سے نالائق طالب علموں میں ہورہا تھا۔ ابو نے عینک لگائی اور دوبارہ رزلٹ کارڈ دیکھا۔لیکن انہیں پھر بھی یقین نہ آیا۔ اب انہوں نے عینک اتار دی۔ شیشے صاف کئے اور پھر عینک لگا کر رزلٹ کارڈ پر نظر ڈالی۔ آخر کار ہم سے پوچھا "کیا واقعی تم فرسٹ آئی ہو؟" ہم نے گردن اکڑا کر کہا "جی ہاں۔" اسی وقت امی بھی کمرے میں آگئیں اور جب انہیں پتہ چلا کہ ان کی بیٹی فرسٹ آئی ہے تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ ہماری وکالت میں ابو سے زبردست بحث کی بلکہ زبردستی ہمیں انعام دلوایا۔

ہم کافی دنوں سے ابو سے ویڈیو گیم خریدنے کے لئے کہہ رہے تھے۔ لیکن ابو ویڈیو گیمز کے خلاف ہیں۔ لہٰذا وہ ہمیں لے کر نہیں دیتے تھے۔ اب جب ہم نے ہپناٹزم سیکھ لیا تھا تو اگلے پروگرام میں ہم نے یہ سوچا کہ کیوں نہ ابو کو ہپناٹائز کیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ ہمیں ویڈیو گیم لے کردیں ——— ہم ابو کے کمرے میں پہنچے۔ ابو کچھ پڑھ رہے تھے۔ ہم نے ابو سے کہا "ابو ہماری طرف دیکھیئے۔" ابو نے کہا "بھئی مجھے پڑھنے دو۔ روز تو تمہیں

دیکھتا ہوں آج کیا خاص بات ہے؟" ہم نے کہا "آپ دیکھئے تو سہی" ابو نے کہا : "اچھا بھئی اور ہماری طرف دیکھا۔" ہم نے ابو کی آنکھوں میں جھانکا اور کہا کہ "آپ سو رہے ہیں۔" ابو نے کہا : "ارے بھئی میں تو جاگ رہا ہوں اگر سو رہا ہوتا تو تم سے باتیں کیسے کر رہا ہوتا۔" "الٰہی خیر" ہم ایک دم گھبرا گئے کہ ابو پر ہپناٹزم کیوں نہیں ہو رہا۔ لیکن جلد ہی وجہ ہماری سمجھ میں آگئی۔ دراصل ہم اپنے ابو سے ڈرتے تھے۔ اس وجہ سے صحیح طرح عمل نہیں کر رہے تھے اور وہ معمول نہ بن سکے تھے۔ ہم نے اپنی ساری قوت جمع کی کیونکہ ویڈیو گیم بھی تو لینا تھا اور آخر ہم نے انہیں ہپناٹائز کر ہی لیا اور ہدایت دی کہ کل آپ ہمیں ویڈیو گیم لاکر دیں گے۔ اگلے دن ہمارا ویڈیو گیم آگیا بس پھر کیا تھا ہم تو ملے خوشی کے ہواؤں میں اڑنے لگے۔

اب ہم سوچنے لگے کہ کس کو ہپناٹائز کریں؟ اسی وقت ہمارے پڑوس سے ایک عورت آئی۔ وہ اکثر و بیشتر ہم سے کوئی نہ کوئی چیز مانگ کر لے جاتی تھیں لیکن واپس کرنا بھول جاتی تھیں شاید ان کی یادداشت کمزور تھی۔ امی مروت کی وجہ سے کہتی نہ تھیں۔ اب بھی شاید کوئی چیز مانگنے آئی تھیں۔ امی نے انہیں بٹھایا اور خود چائے بنانے لگیں۔ ہم نے سوچا کہ ہم اس عورت کو ہپناٹائز کر کے کہتے ہیں کہ ہماری چیزیں واپس کرے۔ یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں امی نہ آجائیں لیکن شکر خدا کا کہ امی نہ آئیں اور ہم نے اپنا عمل مکمل کر لیا۔ اگلے دن وہ عورت ہماری ساری چیزیں واپس کر کے چلی گئی۔ امی بہت حیران تھیں کہ یہ کیا ماجرا ہو گیا۔ اب انہیں کون بتاتا کہ یہ کارنامہ ان کی بیٹی کا تھا۔

اب ہمارے پیش نظر ایک زبردست معرکہ تھا جس میں کامیابی کے لئے ہم پرجوش بھی تھے اور خوفزدہ بھی۔ قصہ یہ تھا کہ ہم اکثر آنکھ مچولی والوں کو کہانیاں بھیجتے رہتے تھے لیکن مجال ہے جو انہوں نے ہماری کوئی تحریر شائع کی ہو۔ حد تو یہ ہے کہ "ناقابل اشاعت" کے کالم تک میں ہمارا نام شائع نہ ہوتا تھا۔ ہم نے چند روز پہلے ہی ایک تازہ بتازہ کہانی لکھی تھی۔ ہم وہ کہانی پوسٹ کرنے کی بجائے آنکھ مچولی کے دفتر پہنچ گئے۔ پہلے تو ہم نے سوچا کہ ایڈیٹر صاحب کہیں ملنے سے ہی انکار نہ کر دیں۔ لیکن ہماری خوش قسمتی کہ ہمیں فوراً اجازت مل گئی۔ اس معرکہ میں یہ ہماری پہلی کامیابی تھی۔ ہم بڑے اعتماد سے ایڈیٹر صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ کامیابی گویا

ہمارے قدم چوم رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے ایڈیٹر صاحب ہمارے ٹرانس میں آکر ہماری ہدایت پر عمل کرنے والے تھے۔ ہم نے بھی ٹھان لیا تھا کہ پچھلے پانچ برسوں کا پورا پورا حساب لیں گے۔ آنکھ مچولی میں اس وقت تک کسی اور کی کوئی تحریر نہیں لکھنے دیں گے جب تک ہماری پانچ برس کی تحریروں کا ڈھیر شائع نہ ہو جائے۔ مگر اس سے پہلے کہ ہم کچھ کہتے امی جان کی غصیلی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ "غضب خدا کا" وہ کہہ رہی تھیں۔ "گیارہ بج رہے ہیں اور یہ لڑکی ابھی تک سو رہی ہے۔" ہم نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ امی جان کو سامنے دیکھ کر ظاہر ہے ہمارے سارے خوبصورت خواب چکنا چور ہو گئے۔ ہم نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔ "امی آپ ہمیں تھوڑی سی اور دیر کے بعد اٹھا دیتیں تو ہم کم از کم ایڈیٹر صاحب کی خبر تو لے لیتے۔"

"کس کی خبر؟" امی جان نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ایڈیٹر کی" ہم نے کہا۔

امی جان کی سمجھ میں شاید اب کے بھی کچھ نہیں آیا تھا۔ اسی لئے تو انہوں نے کچھ دیر خاموش رہ کر کہا۔ "خیر تم یہ ٹرٹر بند کرو اور فوراً بستر چھوڑ دو۔" ہم مسکرا دیئے ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ امی جان کا ڈانٹنا بھی ہمیں اچھا لگا۔ شاید اس لئے کہ ہم اگرچہ ناکام رہے مگر امی جان نے ایڈیٹر صاحب کی خبر لے ہی لی۔

دعا
رب سے ہمارے تعلق کا دوسرا نام ہے

ادارہ آنکھ مچولی نے منتخب دعاؤں کے ۱۲ خوبصورت اسٹیکرز تیار کئے ہیں
ایسی دعائیں
جو نظر کے سامنے ہوں تو اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہونے دیتیں
۱۲ اسٹیکرز کا ہدیہ صرف ۳۶ روپے
آنکھ مچولی کے پتے پر خط لکھئے یا فون کیجئے
ا۔پی آئی بی کالونی۔ کراچی فون: ۴۹۴۲۸۵۷، ۴۹۴۸۲۱۰

20000 ڈالر کی خاطر

احسان الٰہی

یکم جولائی ۱۸۷۴ء کا ذکر ہے۔ وکٹورین طرز کی ایک شاندار حویلی کے باہر دو بھائی چھ سالہ والٹر روز اور چار سالہ چارلی روز کھیل رہے تھے۔ اچانک ایک گھوڑا گاڑی ان کے نزدیک آکر رُکی۔ اس میں دو آدمی سوار تھے۔ بچّوں کے لئے یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ وہ پچھلے چند روز سے گاڑی میں سوار دونوں آدمیوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں آدمی چند منٹ بچّوں سے ہنسی مذاق کرتے اور پھر کھانے کی کوئی چیز دے کر اپنی راہ لیتے۔ اس دفعہ انہوں نے خلافِ معمول بچّوں کو فلاڈلفیا چلنے کی دعوت دی اور لالچ دیا کہ وہ انہیں شہر سے یوم آزادی کے لئے آتش بازی خرید دیں گے۔ بچے پچھلے چند روز میں ان سے مانوس ہوگئے تھے۔ بلا جھجک ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی پالیر سٹریٹ کے چوک میں جا کر رُک گئی۔ ایک آدمی نے والٹر کو آتش بازی خریدنے کے لئے پچیس سینٹ دیئے۔ جب وہ آتش بازی خرید کر واپس لوٹا تو گاڑی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس صورتِ حال سے والٹر پریشان اور خوفزدہ ہوگیا اور رونا دھونا شروع کردیا اتفاقاً"

ایک پڑوسی نے اسے دیکھ لیا اور گھر پہنچایا۔

بچّوں کا باپ کوسٹین روز متوسط طبقے کا ایک کامیاب تاجر تھا۔ اس نے کئی گھنٹے گمشدہ بچّے کا انتظار کیا اور آخر کار پولیس کو اس واقعہ کی اطلاع دے دی۔ لوگ اغوا کے لفظ ہی سے نا آشنا تھے لیکن جب کئی روز گزرنے کے بعد چارلی روز کا کچھ پتہ نہ چلا اور پولیس بھی بڑی دوڑ دھوپ کے باوجود کوئی سراغ نہ لگا سکی تو لوگوں کو احساس ہوا کیا حادثہ پیش آیا ہے۔ اخبارات نے جلی سرخیوں کے ساتھ چارلی روز کی گمشدگی کی خبر شائع کی اور پورے امریکہ میں تشویش اور اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔

چارلی کو گم ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا کہ سٹین روز کو ایک گمنام خط ملا۔ خط کی تحریر شکستہ اور بھدی تھی اس میں لکھا تھا کہ اگر پولیس اس معاملے میں دخل اندازی نہ کرے تو چارلی کو بغیر گزند پہنچائے اس کے باپ کے حوالے کر دیا جائے گا چند روز بعد دیگر کئی اور خط وصول ہوئے جن میں چارلی کی واپسی کے لئے بیس ہزار ڈالر طلب کئے گئے تھے۔ امریکہ کی تاریخ جرائم میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ ایک بچے کو اغوا کر کے یرغمال بنایا گیا اور اس کی واپسی کے لئے فدیہ طلب کیا گیا

کرسٹین نے پولیس کو اس صورت حال سے مطلع کر دیا۔

چند روز بعد مجرموں نے لکھا ہم جانتے ہیں۔ آپ اتنی گراں رقم ادا کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ تاہم آپ کے فلاں امیر کبیر دوست موجود ہیں آپ ان سے رقم مستعار لے کر ہمیں ادا کر سکتے ہیں۔

ایک اور خط میں کرسٹین روز کو ہدایت کی گئی کہ وہ بیس ہزار ڈالر ایک اٹیچی کیس میں بند کر کے فلاڈلفیا پہنچ جائے اور نیویارک جانے والی ٹرین کے پلیٹ فارم کے پچھلے حصے پر جا کر ریلوے لائن کی طرف سے اشارے کا انتظار کرے جونہی اشارہ ملے اٹیچی کیس اس طرف اُچھال دے۔

کرسٹین روز نے ان ہدایات پر عمل کیا۔ لیکن اس نے پولیس سے بھی خفیہ رابطہ رکھا۔ چنانچہ مقررہ روز پولیس سادہ لباس میں تندہی سے تلاش میں مصروف ہو گئی۔ گردونواح کے قصبات کی تلاشی لی گئی۔ فلاڈلفیا سے رو نہ ہونے والی ریل گاڑیوں و بحری جہازوں کا ایک ایک ڈبہ چھان مارا اور بے شمار چھوٹے چھوٹے بچّوں کو شناخت کے لئے پولیس اسٹیشن لے جایا گیا۔ لیکن بے سود۔ چارلی روز نہ ملا۔ پولیس کی ان سرگرمیوں کی بھنک مجرموں کے کانوں میں بھی پڑ گئی اور وہ چوکنّے ہو گئے چنانچہ کرسٹین کو لائن کی طرف سے کوئی اشارہ نہ ملا اور وہ اٹیچی کیس لئے بے نیل مرام واپس آ گیا۔

مایوس اور دل شکستہ باپ کو اُمید کی ایک موہوم کرن نیویارک لے گئی۔ جہاں وہ نیویارک پولیس کے سربراہ والنگ سے ملا اور اسے مجرموں کے خطوط دکھائے۔ والنگ نے نیویارک کے ایک بد نام چور ولیم ہرشر کی تحریر فوراً" شناخت کرلی۔ اس نے پولیس ریکارڈ سے ولیم کے بہنوئی ٹرواٹ کا پتہ معلوم کرلیا جسے حال ہی میں پولیس سے نکالا گیا تھا۔ والنگ نے بہ عجلت اس سے رابطہ قائم کیا اور اس کی مدد سے ولیم کو تلاش کرنے کی کوشش حاصل کی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔

14 دسمبر کی رات برکلین میں دو نقب زن وار دات کرتے ہوئے پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ ایک چور نے دم توڑتے ہوئے اقرار کیا کہ انہوں نے رقم کے لالچ میں چارلی روز کو اغوا کیا اور پھر گرفتاری کے ڈر سے ٹھکانے لگادیا۔ چوروں کو شناخت کرلیا گیا۔ وہ ولیم ہوشر اور جوزف ڈگلس تھے۔ والٹر روز کو برکلین لے جایا گیا جہاں اس نے مُردہ چوروں کو دیکھ کر تصدیق کردی کہ یہی آدمی انہیں گاڑی میں فلاڈلفیا لے گئے تھے۔

تفتیش کے دوران میں پولیس پر انکشاف ہوا۔ اس سارے ڈرامے کا مرکزی کردار ٹروٹ ہے۔ اسی نے اغوا کا منصوبہ بنایا۔ واردات کے روز وہ فلاڈلفیا میں موجود تھا اور چارلی روز کو اغوا کنندگان سے وصول کر کے نیویارک چلا گیا۔ ولیم اور جوزف، کرسٹین روز سے خط و کتابت اور فدیے کی رقم وصول کرنے کے لئے فلاڈلفیا ہی میں ٹھہر گئے۔ اس کیس کی لنکن کے قتل کی طرح خوب شہرت ہوگئی۔ اخبارات میں شہ سرخیوں کے ساتھ روداد شائع ہوئی اور پولیس پوری سرگرمی سے مجرموں کی تلاش میں مصروف ہوگئی۔ ٹرواٹ خوفزدہ ہوگیا اس نے گرفتاری سے بچنے کے لئے چارلی روز کو سمندر میں ڈبو دیا۔

ٹرواٹ کو گرفتار کرلیا گیا اور اس پر امریکہ کی تاریخ جرائم میں بچوں کے اغوا کا پہلا مقدمہ درج ہوا۔ عدالتی کاروائی میں مزید شہادتیں سامنے آئیں پتہ چلا چارلی کے گم ہوجانے کے بعد ٹرواٹ نے کرسٹین روز کے مالی حالات کی چھان بین کی تھی۔ نیویارک کی ایک عورت نے گواہی دی اس نے ٹرواٹ کو ایک چھوٹے بچے کے ہمراہ ٹرالی کار میں جاتے دیکھا تھا۔ ٹرواٹ نے اپنی بے گناہی ظاہر کرنے کے لئے صرف ایک مرتبہ لب کشائی کی۔ لیکن کوئی ٹھوس شہادت فراہم نہ کرسکا۔ چونکہ اس کے اغوا میں براہ راست ملوث ہونے کا ثبوت نہ ملا۔ اس لئے عدالت نے اسے مجرموں سے تعاون کے جرم میں سات سال قیدِ سخت کی سزا دی۔

(ماخوذ)

میرے کھلونے

انیس احمد

یہ تحفے محبت کے پیارے سلونے
مرے پاس ہیں کتنے سارے کھلونے

یہ چھوٹی سی بلّی جو موٹی ہے خاصی
وہ کتّا کہ جس کی ہلے دُم ذرا سی
کھڑے ایک جنگلے میں جنگل کے باسی
جو سب ننّھے مُنّے سے لگتے ہیں بونے
مرے پاس ہیں کتنے سارے کھلونے

یہ مُرغا، یہ بطخ، ہنسوں کا وہ جوڑا
یہ ہاتھی ربڑ کا، وہ لکڑی کا گھوڑا
یہ ممبو، ہے جس نے خموشی کو توڑا
بجا ڈھول اس کا، لگا شور ہونے
مرے پاس ہیں کتنے سارے کھلونے

یہ خرگوش کرتے جو سرگوشیاں ہیں
وہ بندر نقلچی، یہ بھالو یہاں ہیں
یہ جنگل کے راجہ ببر شیر خاں ہیں
جنہیں سب نے مانا، نہیں ایک دو نے
مرے پاس ہیں کتنے سارے کھلونے

وہ جو میرے مرے سے گرہ ملا ہے
وہاں تک ٹیلیفون کا سلسلہ ہے
انوکھی ہے ایجاد، عجب معاملہ ہے
اُٹھایا ریسیور، لگی بات ہونے
مرے پاس ہیں کتنے سارے کھلونے

ذرا ڈاکٹر کی یہ کِٹ تو سنبھالیں
یہ آلہ حرارت کا منہ میں دبالیں
بخار آپ کو ہے، دوائی یہ کھالیں
میں ورنہ لگی ہوں یہ سوئی چُبھونے
مرے پاس ہیں کتنے سارے کھلونے

چلیں آئیں سب، میں نے روٹی پکالی
سبھی مل کے کھائیں، اُٹھائیں وہ تھالی
پئیں چائے جلدی، مجھے دیں یہ پیالی
ابھی ہیں مجھے سب یہ برتن بھی دھونے
مرے پاس ہیں کتنے سارے کھلونے

میں تھوڑا سا پہلے یہ پیانو بجالوں
ذرا دیر جھولے میں ہلکورے کھالوں
پھر آرام کرلوں، دُکاں یہ بڑھالوں
بہت تھک گئی اب میں جاتی ہوں سونے
مرے پاس ہیں کتنے سارے کھلونے

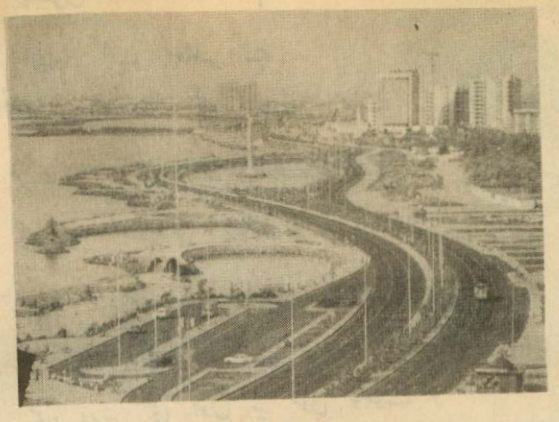

شہر خوش جمال جدہ

ابو غازی محمد

شہر خوش جمال جدہ، دنیا کے مقدس ترین شہر مکہ مکرمہ کے مغرب میں 75 کلو میٹر کے فاصلے پر بحیرہ احمر کے کنارے آباد ہے۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی 300 میٹر اور اس کا رقبہ 1200 مربع کلو میٹر ہے۔ اس وقت جدہ کی آبادی تقریباً 1605000 نفوس پر مشتمل ہے۔ جس میں 200000 (دو لاکھ) پاکستانی ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے اسے سعودی عرب کے صوبہ حجاز کا سب سے بڑا شہر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ 69 فیصد لوگ شہر میں رہتے ہیں اور بقیہ 31 فیصد دیہاتوں میں رہائش پذیر ہیں۔ سرکاری اور قومی زبان عربی ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً" دنیا کی ہر زبان کے لوگ یہاں نظر آتے ہیں۔ مختلف بولیوں، لباسوں اور تہذیبوں کے امتزاج نے جدہ کو دنیا کے چند "مشترکہ" شہروں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔

قدیم زمانے میں جدہ ایک چھوٹا سا غیر

معروف قصبہ تھا۔ جسے کدی قبیلہ کے لوگوں نے آباد کیا تھا۔ ان دنوں اس کا نام جُدّہ تھا۔ جس کے اصطلاحی معنی ہیں "دریا کا وہ حصہ جو خشکی کے قریب ہو" آہستہ آہستہ یہی جُدّہ، جدّہ کے عالمگیر نام میں ڈھل گیا۔

فتح مکہ کے بعد یہ علاقہ بھی سلطنت اسلامیہ کا حصہ بن گیا اور خلافت راشدہؓ، خلافت بنوامیہ و بنو عباس (بغداد) کے ہاتھوں سے ہوتا ہوا 1425ء میں مصر کے مملوک سلاطین کے زیرِ انتظام آیا۔ 1502ء میں جب پرتگیزیوں نے مشرقی سمندروں میں آنے والے مسلمان جہاز رانوں پر حملوں کا آغاز کیا تو سمندر کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے جدہ کی سلامتی بھی خطرے میں نظر آنے لگی۔ 1511ء میں حجاز کے مملوک گورنر حسین الکردی نے شہر کے گرد ایک مضبوط فصیل تعمیر کرادی۔ یوں جدہ بیرونی حملوں سے محفوظ ہوگیا۔ 1517ء اور 1541ء میں پرتگیزیوں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت جدہ پر دوبارہ لشکر کشی کی۔ لیکن دونوں دفعہ انہیں منہ کی کھانا پڑی۔ اور وہ بھاری جانی و مالی نقصان اٹھا کر میدان سے بھاگ نکلے۔ 17 ویں اور 18 ویں صدی میں جدہ پرسکون رہا لیکن 19 ویں صدی کا آغاز ہوتے ہی حادثات نے گویا جدہ کی راہ دیکھ لی اور یہ شہر انقلابات زمانہ کا شکار ہوگیا۔

1803ء میں آل وہاب کے سردار عبدالعزیز بن محمد بن سعود کی فوجوں نے جدہ پر قبضہ کرلیا۔ لیکن 1811ء میں سلطنت عثمانیہ کے سپہ سالار محمد علی پاشا نے ان کو مار بھگایا اور صوبہ حجاز کو ترکی میں شامل کردیا 1916ء میں شریف مکہ علی بن حسین نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کا اعلان کرکے حجاز میں عربوں کی خود مختار حکومت قائم کرلی۔ اس نے سب سے پہلے جدہ پر قبضہ کیا۔ ترکوں سے جنگ کے دوران اس شہر کو عربوں کی سب سے بڑی اور اہم رسدگاہ کی حیثیت حاصل ہوئی۔

اکتوبر 1924ء میں عبدالعزیز بن عبدالرحمان السعود حاکم ریاض نے مکہ مکرمہ پر لشکر کشی تو شریف مکہ علی بن حسین نے جدہ کو اپنا نیا دارالحکومت بنالیا۔ جنوری 1925ء میں سعودی فوجیں جدہ شہر میں داخل ہوگئیں۔ لیکن علی بن حسین کی مضبوط دفاعی منصوبہ بندی کے باعث شہر مسلسل ایک سال تک محاصرے میں رہا دسمبر 1925ء کے آخری دنوں میں سعودی فوجوں نے جدہ پر بھی قبضہ کرلیا۔ 20 مئی 1927ء کو ایک معاہدے کے تحت حکومت برطانیہ نے سعودی

حکومت کو تسلیم کرلیا اور یوں جدہ باقاعدہ طور پر سلطنت سعودی کا حصہ بن گیا۔ 23 ستمبر 1932ء کو عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن السعود نے صوبہ حجاز و نجد کے تمام شہروں اور ترکی صوبہ عسیر پر قبضہ کرنے کے بعد "مملکت السعودیہ العربیہ" کے نام سے نئی سلطنت کے قیام کا اعلان کردیا۔ انہوں نے 1953ء تک حکومت کی اور ان کے انتقال کے بعد بالترتیب شاہ سعود بن عبدالعزیز، شاہ فیصل بن عبدالعزیز اور شاہ خالد بن عبدالعزیز تخت نشین ہوئے۔ موجودہ سعودی فرماں روا شاہ فہد بن عبدالعزیز نے 13 جون 1982ء کو خادم الحرمین الشریفین کی حیثیت سے ملک کا انتظام سنبھالا۔ سعودی فرماں رواؤں نے دیگر شہروں کی طرح جدہ کی تعمیر و ترقی پر بھی خصوصی توجہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شہر سعودی عرب کے اہم تعلیمی، ثقافتی، صنعتی و تجارتی اور مواصلاتی مراکز میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ملک کے انتظامی دارالحکومت ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ دنیا کے پچاس ممالک کے سفارتی دفاتر بھی اسی شہر میں واقع ہیں۔

تعلیم کے شعبے میں جدہ نے قابل ذکر ترقی کی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کے علاوہ حکومت نے یہاں ٹیکنیکل اور پولی ٹیکنیکل سینٹرز بھی قائم کئے ہیں۔ ہزاروں نوجوان ان اداروں میں تربیت پانے کے بعد مختلف شعبوں میں مصروفِ کار ہیں۔ یہاں تعلیم کے تین مراحل (ابتدائی، وسطی اور ثانوی) ہیں۔ ثانوی تعلیم کے بعد کالج اور یونیورسٹی کا بندوبست ہے۔ تمام مراحل میں تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ لڑکے اور لڑکیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ درس گاہیں ہیں اور ہر اسکول میں قرآن وحدیث کی خصوصی کلاسز ہوتی ہیں اور ہر چالیس بچوں کے لئے ایک استاد موجود ہے۔ حکومت پاکستان نے کئی دوسرے ممالک کی طرح جدہ میں بھی ایک "پاکستانی اسکول" قائم کیا ہے۔ جہاں انٹر تک تعلیم دی جاتی ہے۔ طلبہ و طالبات کی تعداد 6000 ہے۔ اس لحاظ سے یہ اسکول بیرون ممالک میں موجود تمام پاکستانی اسکولوں میں سب سے بڑا ہے۔ 1971ء میں قائم کی جانے والی "الجامعہ ملک عبدالعزیز" سعودی عرب کی سات بڑی یونیورسٹیوں میں شمار ہوتی ہے۔ جس میں 15000 طالب علم اعلیٰ تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ یہاں شرح خواندگی کا تناسب 75 فیصد ہے۔

کسی زمانے میں جدہ طب کے میدان میں بہت پیچھے تھا۔ یہاں علاج معالجہ کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اور لوگ اپنے مریضوں

کے ساتھ دوسرے شہروں میں دھکے کھاتے پھرتے تھے۔ لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ حکومت کی بھرپور توجہ کے باعث آج شہر میں چھوٹے بڑے تقریباً 50 ہسپتال (جن میں سب سے بڑا 66 منزلہ ہے) اور 33 ہیلتھ سینٹر موجود ہیں۔ ان سرکاری شفاء خانوں میں مریضوں کا نہ صرف علاج مفت کیا جاتا ہے بلکہ دوائیں ٹیسٹ اور ایکسرے وغیرہ کی سہولتیں بھی بلا معاوضہ فراہم کی جاتی ہیں۔

جدہ کا جنوب مغربی حصہ سعودی عرب کا سب سے بڑا صنعتی علاقہ ہے جس کے 500 سے زائد کارخانوں میں کاغذ، پلاسٹک، صابن، قالین، فرنیچر، عمارتی سامان، الیکٹرونکس کی مصنوعات، کیمیائی کھاد، سیمنٹ، پتھر اور ماربل کی اشیاء بجلی کے آلات، پمپ، موٹریں، خوشبویات، مشروبات، چینی، بسکٹ، چاکلیٹ، آئس کریم، دودھ اور دہی کی مصنوعات اور بے شمار دوسری اشیاء عالمی معیار کے مطابق تیار کی جاتی ہیں۔ تیل اور سنگ مرمر صاف کرنے کے چند کارخانے بھی کام کر رہے ہیں اور ایک علیحدہ صنعت کھجوروں کی پیکنگ کی ہے۔ جو، باجرہ، گندم، انگور، انار، سیب اور تقریباً 80 سے زائد اقسام کی کھجوریں یہاں کی اہم زرعی اجناس ہیں۔

مواصلات کے شعبہ میں جدہ نے حیران کن ترقی کی ہے۔ محکمہ ہائی ویز نے جدید، کشادہ اور تیز رفتار شاہراؤں کے ذریعے جدہ کو ملک کے اہم شہروں کے علاوہ ترکی مصر اور شام سے مربوط کر دیا ہے۔ شہر ہی کے ایک حصے میں باقاعدہ ایک مواصلاتی شہر "ملک فہد کمیونیکیشن سٹی" کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔ سعودی عرب کی سب سے طویل ایکسپریس ہائی وے "طریق الہجرہ" ہے جو جدہ کو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ سے ملاتی ہے۔ 425 کلومیٹر لمبی یہ عظیم الشان شاہراہ تقریباً اسی رستے پر تعمیر کی گئی ہے جس پر سفر کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی۔ اس سے 40 سے 70 کلو میٹر تک لمبی ذیلی سڑکیں نکال کر آس پاس کے دیہات کو بھی جدہ شہر سے ملا دیا گیا ہے۔ "طریق الہجرہ" کی خاص بات یہ ہے کہ سپانکو (سعودی پبلک ٹرانسپورٹ کمپنی) کی ایئر کنڈیشنڈ اور آرام دہ بس یا اپنی گاڑی میں سفر کرتے ہوئے آپ کو کہیں بھی کوئی ٹریفک سگنل نظر نہیں آئے گا جو اس بات کا اعلان ہے کہ آپ مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ کے متبرک و محترم سفر کو بغیر کہیں رکے تیزی سے طے کر سکتے ہیں۔

فلائی اوور طرز پر بنائی جانے والی 15 کلو میٹر

لمبی جدہ۔مکہ ایکسپریس روڈ بھی ایک انفرادی خوبی کی حامل ہے اور وہ یہ کہ آپ کی آمد فضائی' بری یا بحری کسی بھی راستے سے ہو مکہ کو جانے کے لئے آپ کو اس سڑک پر سے گزرنا ہی پڑے گا!!

شہر کے جنوب میں 21 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع جدہ اسلامک پورٹ ہے۔یہ بندرگاہ سات چھوٹی چھوٹی بندرگاہوں کا مجموعہ ہے۔ جو ایک لاکھ ستر ہزار (170000) مربع میٹر کے رقبہ میں پھیلی ہوئی ہیں۔ "جدہ اسلامک پورٹ" کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس کا پہلا سراغ حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت میں ملتا ہے۔جب آپؓ نے خلافت سنبھالنے کے بعد شعیبہ کی جگہ جدہ کو مکہ مکرمہ کی نئی بندرگاہ کا درجہ دیا تھا۔ 1976ء میں جب "السعودیہ پورٹ اتھارٹی" کا قیام عمل میں آیا تو اسے جدید اور سائنسی خطوط پر ترقی دی گئی اب جدہ کی بندرگاہ 45 جہازی گودیوں اور 15 لاکھ ٹن سامان کی گنجائش رکھنے والے وسیع و عریض گودام پر مشتمل ہے اور اس کا تمام تر نظام مکمل طور پر کمپیوٹرائزڈ ہے۔ہر سال دنیا بھر سے تقریباً" 50 ہزار حجاج بحری جہازوں کے ذریعے "گیٹ وے ٹو مکہ" تک پہنچتے ہیں۔ یہ بندرگاہ ملک کی معاشی ترقی میں بھی بہت اہم کردار ادا کررہی ہے۔ تجارتی سامان کا بڑا حصہ یہیں سے دوسرے ممالک کو بھیجا جاتا ہے۔جدہ اسلامک پورٹ کا 12.5 کلو میٹر لمبا ڈبل وے پل یعنی "پورٹ برج" جدید انجینئرنگ کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے جو صرف 34 ماہ کے عرصہ میں انجام دیا گیا۔ یہ پل جدہ مکہ ایکسپریس روڈ سے جا ملتا ہے۔ اور اس سے نکالی جانے والی ذیلی سڑکوں کے ذریعے کارگو کا سامان باحفاظت اور جلد از جلد صنعتی شہر تک پہنچایا جاتا ہے۔

جدہ کا "ملک عبدالعزیز انٹرنیشنل ایئرپورٹ" بھی جدید تعمیری کارنامہ ہے۔ شہر کے شمال میں 19 کلومیٹر کے فاصلے پر بنایا گیا یہ ہوائی اڈہ 8 سال کے عرصے (1974-82ء) میں مکمل ہوا ہے۔ اس کا رقبہ 105 مربع کلو میٹر اور ٹرمینلز کی تعداد چار ہے۔ ایک ٹرمینل شاہی خاندان' غیر ملکی سربراہان مملکت اور سفارت کاروں کے لئے مخصوص ہے۔جبکہ دوسرا' تیسرا اور چوتھا بالترتیب سعودی ایئرلائن' غیر ملکی فضائی کمپنیوں اور حاجیوں کے لئے ہے۔ حج ٹرمینل کا رقبہ 510000 مربع میٹر ہے۔ ہر سال 90 فیصد حاجیوں کا استقبال کرنے والا یہ ٹرمینل فائبر گلاس سے بنے ہوئے 210 خیموں پر مشتمل ہے۔ 1983ء میں اسے آغا خان ایوارڈ برائے اسلامک آرکیٹیکٹ دیا گیا تھا۔ جو اس بات کا ثبوت ہے

کہ سائنسی بنیادوں پر قائم کیا جانے والا یہ ایئرپورٹ دنیا کی جدید اور عمدہ تعمیرات میں سے ایک ہے۔

جدہ میں ٹیلی فون اور ڈاک کا نظام بھی قابل ستائش ہے۔ ہماری ملک کی طرح یہاں کال دیر سے نہیں ملتی اور نہ ہی ڈاک تقسیم کرنے کے جھنجھٹ سے بچنے کی خاطر خطوط کے بورے کچرا گھروں میں پھینکے جاتے ہیں۔ آپ جہاں بھی بات کرنا چاہتے ہوں۔ مستعد آپریٹر ایک لمحہ کی تاخیر کئے بغیر مطلوبہ نمبر فراہم کردے گا۔ اسی طرح خطوط کی امانتیں بھی انتہائی ذمہ داری کے ساتھ کم سے کم وقت میں مقررہ مقامات تک پہنچا دی جاتی ہیں۔

کھیلوں میں فٹ بال سب سے مقبول ہے۔ جس کے فروغ کے لئے بہترین انتظامات کیے گئے ہیں۔ شہر میں چار بڑے اسٹیڈیم بھی بنائے گئے ہیں۔ عوام کو تفریح فراہم کرنے کی غرض سے تین اسٹیج ڈرامہ ہال، بچوں کے لئے دو چڑیا گھر، قدیم نوادرات کا ایک عجائب گھر، بے شمار ہیلتھ کلب اور تقریباً 300 پارک قائم کئے گئے ہیں۔ سب سے بڑا "پبلک پارک" ہے جس کا رقبہ 30 لاکھ (3000000) مربع میٹر ہے۔ ان کے علاوہ شہر میں ایک نمائش گاہ بھی بنائی گئی ہے۔ جہاں محکمہ ثقافت کے زیر اہتمام سال میں دس بارہ مختلف قسم کی نمائشیں منعقد ہوتی ہیں۔

لوگوں کو حالات و واقعات سے باخبر رکھنے کے لئے چار عربی (البدر، اوکاز، المدینہ، اور الندوہ) اور دو انگریزی (عرب نیوز اور سعودی گزٹ) اخبار شائع ہوتے ہیں۔ "اقراء" اور "باسم" کے نام سے دو ہفتہ وار میگزین کا اجراء بھی کیا جاتا ہے۔ 1985ء میں یہاں دو چینلز (عربی اور انگریزی) کا ایک ٹیلی ویژن اسٹیشن بھی قائم کیا گیا ہے۔ جدہ ریڈیو عربی اور انگریزی کے علاوہ روزانہ دو گھنٹے کے اردو پروگرام بھی نشر کرتا ہے۔ **جمجوم**، شرق الاوسط، محمل، قزاز، **الفتحی**، سلیمانیہ اور الحمراء جدہ کے بڑے اور مصروف ترین تجارتی مراکز ہیں۔ ان میں **جمجوم** کا شمار دنیا کے بڑے شاپنگ سینٹرز میں ہوتا ہے۔

یہاں قدیم و جدید طرز تعمیر کی تقریباً 462 مساجد ہیں۔ اور ہر مسجد میں خواتین کے لئے علیحدہ حصہ مخصوص ہے۔ بڑی مسجدوں میں عصر کی نماز کے بعد باقاعدہ "درس" بھی دیا جاتا ہے۔ مسجد **السعود**، مسجد بن لادن، مسجد امیر **مطعب** اور مسجد الحمراء اسلامی فنِ تعمیر کے قابلِ دید نمونے ہیں۔

جدہ کے شہری بہت بااخلاق اور ملنسار ہیں۔

اسلامی احکامات کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ مہمان کی انتہائی قدردانی ان کے یہاں ملتی ہے۔ ہر شخص قانون کا قابلِ تقلید احترام کرتا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ کسی حادثے کی صورت میں دونوں گاڑیوں کے ڈرائیور ہمارے یہاں کے ڈرائیور حضرات کی طرح دم دبا کر بھاگتے نہیں بلکہ اپنی اپنی گاڑیوں سے باہر نکل کر ٹریفک پولیس کے آنے کا انتظار کرتے ہیں۔

یہ لوگ صفائی کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ان کے ہر کام میں نفاست جھلکتی ہے۔ میونسپل کارپوریشن کے ملازمین روزانہ فجر کی نماز سے پہلے ہی شہر کے چپے چپے میں پھیل جاتے ہیں اور کوڑا کرکٹ سمیٹ کر ہوا ہو جاتے ہیں اور جب زندگی جاگتی ہے تو صاف ستھرا شہر اس کا منتظر ہوتا ہے۔ اگر آپ ثبوت چاہتے ہیں تو ساحل سمندر کے قریب واقع مچھلی بازار چلے جایئے۔ جہاں گندگی تو کجا بُو تک بھی محسوس نہیں ہوتی۔

شہر کے وسط میں شامیہ کا علاقہ واقع ہے۔ جو اپنی قدیم طرز کی خوبصورت اور دلکش عمارتوں کی وجہ سے شہرت کا رکھتا ہے یوں تو جدہ کی ہر چیز ہی یہاں آنے والوں کو متاثر کرتی ہے لیکن سمندر (بحیرہ احمر) کے درمیان میں بنائے گئے "ملک فہد فوارہ" کی بات ہی کچھ اور ہے۔ یہ فوارہ 260 میٹر کی بلندی تک پانی اچھالتا ہے۔ خصوصاً" رات کے وقت یہ منظر اور زیادہ دلکش ہوجاتا ہے، جب اس کے اچھلتے گرتے پانی پر لحہ بہ لحہ رنگ بدلتے انتہائی طاقتور قمقموں کی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ شہر کے ہر حصے سے اس ناقابل فراموش منظر کی جھلک باآسانی دیکھی جاسکتی ہے۔

ساحل کے قریب ہی ایک تکون نما چھبیس منزلہ عمارت ہے۔ یہ "قومی تجارتی بینک" ہے۔ جس کے ڈیزائنر شکاگو (امریکہ) کے فلک بوس ہیرس ٹاور کے خالق اور پاکستان کے عالمی شہرت یافتہ ماہرِ تعمیرات جناب فضل الرحمٰن مرحوم تھے۔

دو معلق پلوں کے علاوہ بحیرہ احمر کے اندر بڑے بڑے ستونوں پر دو خوبصورت مسجدیں (مسجد دلّہ اور مسجد منان) بھی بنائی گئی ہیں۔ مسجد منان میں ایک باغ بھی موجود ہے۔ بعض مقامات پر سمندر کا سینہ چیر کر جھیلیں تخلیق کی گئی ہیں۔

جدہ کی ایک اور دل کشی اس کی پرکشش یادگاریں ہیں۔ ان میں سے بعض تو ساحلِ سمندر کے نزدیک تعمیر کی گئی ہیں جبکہ زیادہ تر یادگاریں آپ کو شہر کے ہر سو سے دو سو میٹر قطر

کے چوراہے پر نظر آئیں گی۔ ایک چوک پر دنیا کی سب سے بڑی سائیکل (جس کی بلندی آٹھ منزلہ عمارت سے کسی طرح کم نہیں) نصب کی گئی ہے۔ قریب ہی اس کا فاضل پہیہ بھی رکھا گیا ہے۔

چوک فلک پر آسمان اور اس پر چمکتا چاند اور ستارے دکھائے گئے ہیں طارق بن زیاد چوک پر بہت سی کشتیاں بپھری ہوئی لہروں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھتی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح کئی چوراہوں پر چاند کے گھٹنے بڑھنے کے عمل کی فلکیاتی عکاسی کی گئی ہے۔ ایک چوراہے پر ستارے مدار میں گردش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ان تین سو سے زائد حیرت انگیز یادگاروں میں بعض ایسی بھی ہیں جو گنیز بک کے ورلڈ ریکارڈ توڑنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ لیکن اسلامی ملک میں ہونے کی وجہ سے گوروں کی تنگ نظری کا شکار ہیں..... واہ رے مغرب تیری روشن خیالی اور تیری جمہوریت پسندی!!!

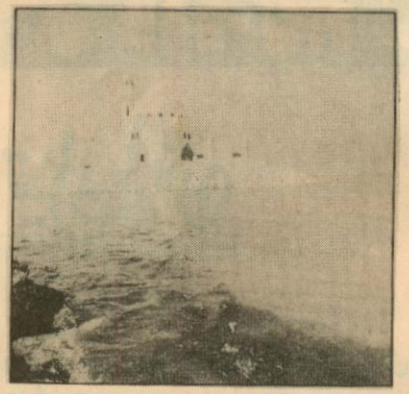

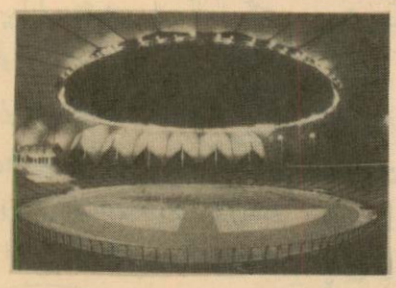

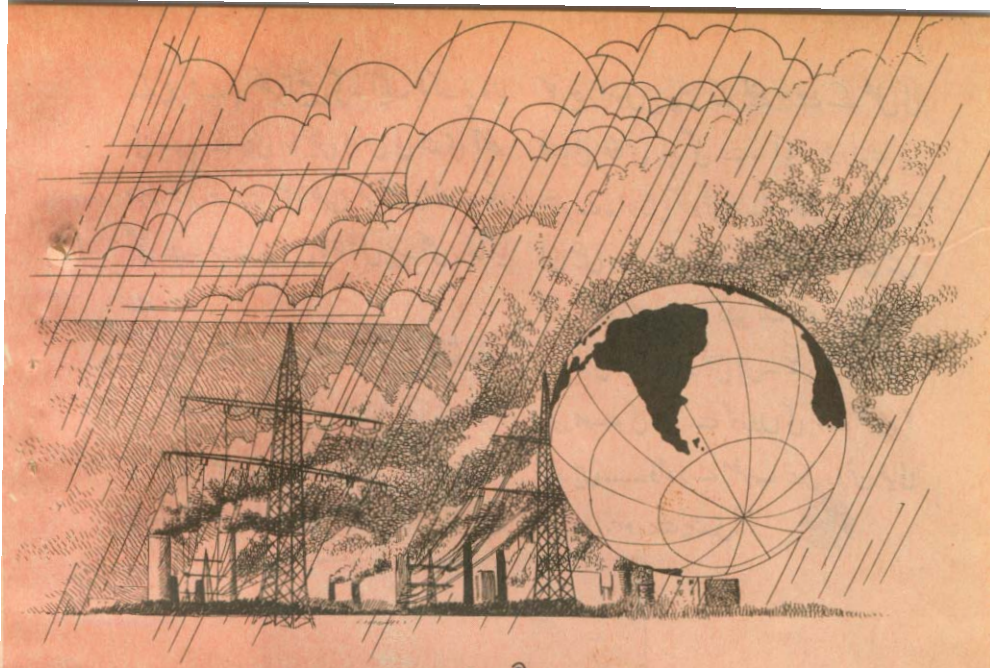

تیزابی بارش

یاسر اعجاز

آبادی میں اضافے نے جہاں دوسرے بے پناہ مسائل پیدا کردیئے ہیں وہاں آلودگی جیسے بڑے مسئلے کو بھی جنم دیا ہے۔ آلودگی نے اس وقت پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ کوئی ملک بھی اس بلا سے بچ نہیں سکا ہے۔ آلودگی کی وجہ سے آج دنیا میں ایک اور خطرہ بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے اور یہ خطرہ تیزابی بارش (Acid Rain) ہے۔ یہ بھی آلودگی ہی کی پیداوار ہے جو ایندھن کے بے پناہ استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ برطانوی کیمیادان رابرٹ اینگس اسمتھ "Robat Angus Smith" نے آلودگی اور ایسڈ رین کے درمیان تعلق کو ۱۸۷۲ء میں ہی بیان کردیا تھا۔ لیکن حال ہی میں اس مسئلے نے پوری دنیا کو پریشان کرکے رکھ دیا ہے۔

تیزابی بارش کیا ہوتی ہے؟

بارش کے قطرے اپنے اندر حل شدہ کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کی تھوڑی بہت مقدار رکھتے ہیں، چونکہ یہ ایک تیزابی گیس ہے اس لئے ساری بارش ہی تھوڑی بہت تیزابی ہوتی ہے لیکن خطرناک تیزابی بارش یا ایسڈ رین وہ ہے جس کے اندر سلفر ڈائی آکسائیڈ اور نائٹروجن ڈائی آکسائیڈ ہوا میں جاکر پانی کے ذرات سے مل کر نائٹرک ایسڈ اور سلفیورک ایسڈ بناتے ہیں ان دونوں تیزابوں کے ملنے سے بارش انسانی، حیوانی اور نباتاتی زندگی کے لئے بہت خطرناک ہوجاتی ہے۔ فضا میں سلفر ڈائی آکسائیڈ کا تقریباً ۱۰ فیصد حصہ آتش فشانی سے، جنگلوں کو آگ لگنے سے اور نامیاتی مادوں کے گلنے سڑنے سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس کا ایک بہت بڑا حصہ بجلی گھروں، فیکٹریوں، دفتروں، گھروں اور آٹو موبائیلز میں کوئلے، تیل، گیسولین اور قدرتی گیس کے جلنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے شمالی امریکہ اور مغربی یورپ کے بعض حصوں میں ہونے والی بارش نارمل بارش سے سہ گنا زیادہ تیزابی ہوتی ہے۔

تیزابی بارش خشک یا تر دونوں قسم کی ہوسکتی ہے۔ خشک تب ہوتی ہے جب ہوا سلفیٹ اور نائٹریٹ کے ٹھوس ذرات سے ملتی ہے اور ہوا کے چلنے سے یہ زمین پر گر پڑتے ہیں اور مختلف اشیا پر گر کر ان پر جم جاتے ہیں۔ اگر یہ پودوں پر گریں تو پودوں کو مکمل طور پر تباہ کردیتے ہیں۔ تر تیزابی بارش تب ہوتی ہے جب یہ ذرات چند دنوں کے لئے ہوا میں رہتے ہیں اور پانی کے ذرات سے مل کر بارش یا برف بناتے ہیں۔ اس کی دونوں اقسام ہی بہت خطرناک ہیں۔

تیزابی بارش سے زمین کی تباہی

تیزابی بارشوں سے زہریلے مادے جب مٹی کے اندر جاتے ہیں تو آس پاس کھڑے پودے اپنی تمام تر جمع شدہ خوراک اور نمکیات وغیرہ خارج کردیتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ بالکل مردہ ہوجاتے ہیں۔ اس عمل سے جنگلات کے جنگلات اور فصلوں کی فصلیں ختم ہوجاتی ہیں۔ اور زمین بالکل بنجر ہوجاتی ہے۔ زمین کے نیچے موجود پانی زمین سے ایلومینیم اور اس جیسے خطرناک مادے جذب کرتا ہے اور جب یہ پانی دریاؤں اور جھیلوں میں جاتا ہے تو ان کو بھی زہریلا کردیتا ہے جس کی وجہ سے آبی حیات کو زبردست نقصان پہنچتا ہے اور اگر کوئی جانور یا انسان یہ پانی پی لے تو اسے بھی سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ تیزابی بارشیں صنعتی ممالک جیسے برطانیہ، امریکہ، روس، جرمنی، فرانس، چیکو سلواکیہ، پولینڈ اور کینیڈا میں ہوتی ہیں۔ تیز

ہوائیں زہریلے ذرّات کو ہزاروں میل دور لے جاتی ہیں اس لئے ایک ملک کی آلودگی دوسرے ملک میں ہونے والی تیزابی بارشوں کا سبب بن سکتی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ کینیڈا میں ہونے والی تیزابی بارشوں کا تقریباً ۶۵ فیصد امریکہ کی آلودگی کی وجہ سے ہوتا ہے

تیزابی بارشوں سے بچاؤ

پوری دنیا میں تیزابی بارشوں سے بچاؤ کے لئے کئی تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ ایندھن کو جلانے سے پہلے اس میں سے سلفر کی مقدار کم کردی جاتی ہے۔ اگر چولہوں کو کم درجۂ حرارت پر استعمال کیا جائے تو اس سے پیدا ہونے والی نائٹروجن ڈائی آکسائیڈ کو بھی کم کیا جاسکتا ہے۔ توانائی پیدا کرنے کے پلانٹوں اور آٹوموبائیلز کے اخراجی پائپوں کے ساتھ اگر فلٹر لگا دیئے جائیں تو اس سے بھی ان ذرّات کا اخراج کم کیا جاسکتا ہے۔ ۱۹۸۴ء میں کینیڈا اور ۲۰ یورپی ممالک نے ایک ایسی تنظیم بنائی ہے جس کا مقصد ۱۹۹۳ء تک سلفر کے اخراج کو ۳۰ فیصد تک کم کرنا تھا۔

بہت سے فضائی آلودگی کے ماہرین کا کہنا ہے کہ تیزابی بارش کے بارے میں ابھی مکمل طور پر معلوم نہیں کیا جاسکا۔ اس کے عوامل کو جاننے کے لئے مزید تحقیق کی جانی چاہئے۔ آلودگی اور تیزابی بارشوں سے بچاؤ کے لئے پوری دنیا کے ماہرین کوشش کررہے ہیں لیکن ابھی تک اس کا کوئی حل دریافت نہیں کیا جاسکا۔ کیونکہ دنیا کی آبادی میں اتنی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے کہ تمام احتیاطی تدابیر بے بس ہو کر رہ جاتی ہیں

افریقہ کے جنگلوں میں!

مرسلہ ...... محمد عبدالستار خان، بدریوالہ۔

۱۔ "گریہ" نامی ایسا درخت ہے جس کے نیچے آگ جلانے سے وہ رونے لگتا ہے اور اس کے پتوں و شاخوں سے پھوار برسنے لگتی ہے۔

۲۔ "لوہبرا" نامی ایسا درخت ہے جس کی شاخیں کاٹنے پر خون بہنے لگتا ہے۔

۳۔ "کرد" درخت کی شاخیں لوہے سے زیادہ سخت ہوتی ہیں۔

۴۔ دریا کی مچھلیوں کی بعض اقسام اڑتی ہیں اور درختوں پر گھونسلے بنا کر رہتی ہیں۔

۵۔ ایک ایسا بھی درخت ہے جس کی شاخیں پکانے پر مچھلی کے گوشت کا سا ذائقہ آتا ہے۔ ان کو کھانے والا بوڑھا بھی جوان ہو جاتا ہے۔

۶۔ صحرا کے درختوں میں سے رات کو سات رنگ کی روشنیاں نکلتی ہیں۔

(صادق حسین صدیقی کے ناول "فتح افریقہ" سے اقتباس)

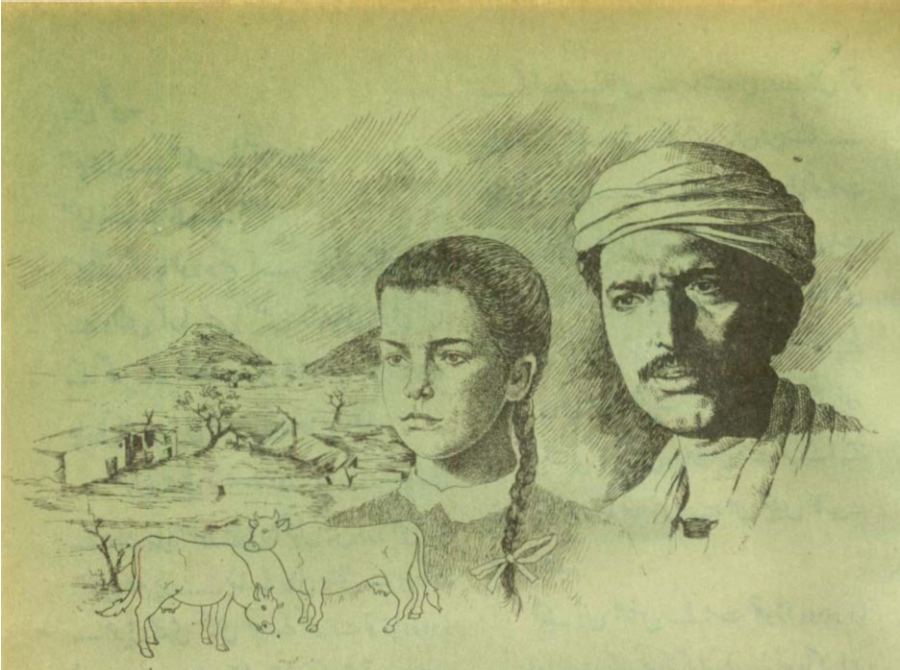

سیلاب

حامد علی شاہد

وہ گاؤں درمیانے درجے کا گاؤں تھا۔ نہ زیادہ بڑا، نہ زیادہ چھوٹا۔ کچے مکانوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ چند پکے مکان تھے اِن میں گوالے کا مکان بھی تھا جو ندی کے بالکل ساتھ سرسبز و شاداب جگہ پر واقع تھا۔ گوالے کی دنیا بہت ہی مختصر تھی۔ ایک بیوی اور ایک سات سالہ چاند سی بیٹی ..... گوالا اسے بہت چاہتا تھا اور اس کی ہر خواہش ہونٹوں پہ آنے سے پہلے ہی پوری کر دیتا تھا۔ دونوں میاں بیوی اسے پیار سے چاندنی کہتے تھے۔ چاندنی ہر وقت اپنی گڑیا کے ساتھ کھیلتی رہتی تھی۔

اس دن موسم بہت سہانا تھا۔ بادل آسمان پہ چھائے تو گرمی کا زور ٹوٹ گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی بھیگی بھیگی ہوا چلنے لگی۔ چاندنی اپنی گڑیا کو لے کر صحن میں لگے برگد کے درخت کے نیچے بیٹھ گئی اور گڑیا سے کھیلنے لگی۔ ماں صحن میں جھاڑو دے

رہی تھی۔

"چاندنی....." ماں نے آواز دی۔

"کیا بات ہے ماں.....؟"

"بھاگ کر جا اور دیکھ آ..... تیرا ابا پرانی حویلی سے واپس آرہا ہے یا نہیں۔" پرانی حویلی ان کے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھی جہاں چاندنی کا باپ اپنی بھینسیں باندھا کرتا تھا۔

"ماں حویلی تو بہت دور ہے ....." چاندنی نے بہانہ بنایا "اور میری ٹانگوں میں درد بھی ہے"

"چل کام چور..... بہانے بناتی رہتی ہے ہر وقت .... حویلی تیری سہیلی نجو کے گھر سے تو زیادہ دور نہیں ..... دن میں آٹھ آٹھ چکر لگاتی ہے اس کے گھر کے ..... کام کی نہ کاج کی' دشمن اناج کی ....." ماں خود ہی بڑبڑا کر چپ ہوگئی۔

کچھ ہی دیر بعد گوالا برتن اٹھائے اندر داخل ہوا ..... اس برتن میں دودھ تھا۔ وہ ابھی ابھی بھینسیں دوہ کر آرہا تھا۔ چاندنی کو خوب پتا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ وہ صبح شام یہ منظر دیکھتی تھی اور افسوس کرتی تھی۔ گوالے کی آواز سنتے ہی وہ کھیل چھوڑ کر اس کے پاس آگئی۔

"کیسی ہے ہماری دھی رانی .....؟" گوالے نے چمکارتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہوں ....." چاندنی نے منہ بنا کر کہا

..... گوالے نے اس کے سامنے ہی دودھ میں اتنا پانی ملایا کہ ایک برتن کے تین برتن بن گئے ..... چاندنی کے چہرے پہ اداسی چھاگئی.... وہ ابا کو بہت منع کرتی تھی مگر ابا قہقہہ لگا کر ہمیشہ اس کی بات ٹال جاتا تھا!! ..... اب تو اس نے کچھ کہنا بھی چھوڑ دیا تھا گوالا شروع سے برا شخص نہ تھا پہلے پہل اس کی صرف ایک بھینس ہوا کرتی تھی اور وہ اس بھینس کا خالص دودھ فروخت کرکے اتنے پیسے لے کر آتا تھا جس سے ان تینوں کا پیٹ بھر جاتا تھا۔

ایک دن بھینس نے بہت تھوڑا دودھ دیا ..... اس دودھ کو دیکھ کر گوالے نے سوچا کہ اس سے حاصل ہونے والے روپوں سے وہ تو کیا چاندنی بھی پیٹ بھر کے نہیں کھاسکتی ..... اس دن ڈرتے ڈرتے اس نے دودھ میں تھوڑا سا پانی ملا دیا۔

بازار تک کا فاصلہ اس نے ہانپتے کانپتے طے کیا مگر جب دودھ میں پانی کا شبہ کسی کو بھی نہ ہوا تو اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اب تو وہ روزانہ پانی ملا کر دودھ دگنا کرلیتا ..... اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے ایک سے تین بھینسیں بنالیں۔ مکان بھی پکا کرالیا۔ گھر میں تقریباً سبھی سہولتیں مہیا ہوگئیں۔ اب گوالا گاؤں کا امیر ترین شخص تھا۔

لوگ اس کے دودھ سے نالاں تو بہت تھے مگر مجبور تھے۔گاؤں میں ایک ہی گوالا تھا۔اس لئے اس سے دودھ خریدنا ان کی مجبوری تھی۔ گاؤں والے اس سے دودھ کے پتلا ہونے کی شکایت کیا کرتے تو وہ جواب میں ایک زور دار قہقہہ لگاتا اور کہتا ..... "میں کیا کروں جناب عالی بھینسیں پانی بہت پی جاتی ہیں۔ جب پانی پیش گی تو دودھ تو پتلا ہو گا ہی....."

گوالا دودھ لے کر باہر چلا گیا اور چاندنی دوبارہ کھیلنے لگی ..... مگر اس کا کھیل میں بھی دل نہ لگا .... اسے ابا بہت اچھا لگتا تھا۔ مگر ابا کی یہ عادت اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ وہ اداس ہو کر دروازے پر بیٹھ گئی.....

"چاندنی....."

"کیا ہے ماں.....؟"

"اندر آجا ..... بارش شروع ہونے والی ہے۔"

"اچھا ماں ....." وہ ماں کے ساتھ چھپر میں بیٹھ گئی۔

"لگتا ہے بہت زور کی بارش ہوگی ....." ماں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "دیکھ تو سہی آسمان کس قدر کالا ہو رہا ہے ..... یا اللہ خیر!"

لیکن چاندنی ماں کی باتیں نہیں سن رہی تھی۔ وہ تو ابا کے متعلق سوچ رہی تھی اور تھوڑی دیر پہلے ہونے والے واقعہ کے متعلق سوچ رہی تھی.....

موسلا دھار بارش شروع ہوگئی' ماں نے لپک کے چھوٹی موٹی چیزیں اندر رکھ دیں ..... چاندنی کو بھی جیسے ہوش آگیا۔ اس نے اپنی گڑیا درخت کے تنے سے اٹھائی اور اندر لے آئی ..... وہ دیکھ تو بارش کو رہی تھی مگر اس کا دھیان بار بار دودھ کی طرف جا رہا تھا.....

"اونہہ ..... کمبخت ....." اس نے سر جھٹک کر دھیان بٹانے کی کوشش کی.....

"کمبخت ..... کون کمبخت؟؟" ماں حیرت سے بولی۔

"کوئی بھی نہیں ....." اس نے جھوٹ بولا....

"پاگل ہوگئی ہے کیا...؟ ہر وقت اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی ہے۔" ماں نے کہا پھر اچانک اس کا دھیان گوالے کی طرف چلا گیا .....

"تیرے ابا نے بہت دیر لگا دی ..... بارش بھی بہت تیز ہوگئی ہے۔ یا اللہ خیر....."

اس لمحے گوالا دروازے پر نمودار ہوا ..... اس کا پھولا ہوا سانس بتا رہا تھا کہ وہ دوڑتا ہوا آیا ہے۔

"چاندنی کی ماں ....." وہ وہیں سے چلایا۔

"کیا بات ہے .....؟" گوالے کے چہرے پر پریشانی دیکھ کر وہ بھی فکر مند ہوگئی۔

"چاندنی کو لے کر باہر آجا.... سیلاب آنے والا ہے.... جلدی کر....." وہ پھر چلّایا۔

"ہائے میرے اللہ میں ضروری چیزیں نہ اٹھالوں....؟" ماں نے کلیجہ تھام لیا۔

"ان باتوں کا وقت نہیں..... چاندنی کو لے کر فوراً باہر آ.....پانی چند لمحوں کے بعد آنے والا ہے....."

وہ تینوں گرتے پڑتے نزدیکی چوٹی پر چڑھ گئے۔ وہاں گاؤں کے بہت سے لوگ جمع تھے اور باقی بھی ادھر کا رخ کر رہے تھے۔لوگوں کی چیخ وپکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اتنے میں پانی کا ایک تیز ریلا آیا اور گوالے کے مکان کو بہا کر لے گیا۔ گوالے کا چہرہ لٹک گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی سارے گاؤں میں پھیل گیا۔وہ رات انہوں نے چوٹی پر ہی گزاری..... صبح تک بارش تھم گئی تھی۔سیلاب کا زور بھی ٹوٹ گیا تھا۔ پانی گاؤں سے باہر دریا کا رخ کر رہا تھا۔ لوگ نیچے اتر آئے۔ گوالا بھی بیٹی کو کندھے پہ بٹھائے نیچے آگیا..... اور گھر کا جائزہ لینے لگا۔ ہر چیز تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ بھینسیں جانے کہاں چلی گئی تھیں؟ پانی انہیں پتا نہیں کہاں بہا لے گیا تھا؟

"چچ..... چچ..... چہ..... چہ....." گوالے نے افسوس سے سر ہلایا۔ "کچھ بھی نہیں بچا....."

"چاندنی کی ماں..... اتنی زندگی گزر گئی مگر اس سے بڑا سیلاب نہ پہلے کبھی دیکھا ہے اور نہ سنا"

"ابا....." چاندنی نے آہستہ سے کہا۔

"ہوں....."

"ایک بات کہوں...؟"

"کہو بیٹا!!"

"آپ خفا تو نہیں ہوں گے.....؟"

"نہیں بیٹا..... ہم بھلا اپنی بیٹی سے کیوں خفا ہونے لگے.....؟"

"ابا....." چاندنی رک گئی۔

"ہاں ہاں..... کہو بیٹا!!"

"ابا..... یہ سیلاب کا پانی وہی پانی ہے..... جو آپ دودھ میں ملایا کرتے تھے....."

گوالے نے چونک کر چاندنی کو دیکھا..... اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ننھی چاندنی نے اتنی بڑی بات کہہ دی ہے۔وہ اپنے آپ کو ننھی منی چاندنی کے سامنے بہت چھوٹا اور حقیر سا محسوس کرنے لگا..... اچانک وہ اٹھا اور اس نے جھپٹ کر چاندنی کو گلے سے لگالیا..... اس کے دل سے قیمتی چیزوں کی تباہی و بربادی کا افسوس اور تاسّف بالکل ختم ہوگیا۔ وہ تو اپنے اندر ایک نئی کرن پھوٹتی ہوئی محسوس کر رہا تھا..... روشنی کی کرن.....دودھیا چاندنی کی کرن.....

راحت کی تصویر ہے تُو ننھّی کیوں دلگیر ہے تُو

کوپن برائے خریداری آنکھ مچولی (۱۲ شمارے)

(۱۲ شماروں کی رعایتی قیمت اندرونی سرورق پر دیکھئے)

نام: _____ ولدیت: _____

کلاس: _____ تعلیمی ادارہ: _____

پتہ: _____

براہِ مہربانی مجھے _____ تاریخ سے آنکھ مچولی جاری کر دیا جائے

فون نمبر: _____ دستخط: _____

کوپن برائے "کیپشن لگائیے انعام پائیے"

نام: _____ ولدیت: _____

کلاس: _____ تعلیمی ادارہ: _____

پتہ: _____

کیپشن: (_____)

کوپن برائے قصہ کوئز

نام: _____ ولدیت: _____

کلاس: _____ تعلیمی ادارہ: _____

پتہ: _____

_____

نوٹ: ہر شعبے کے لئے الگ کوپن آنا ضروری ہے۔ ایک کوپن پر ایک ہی نام آسکتا ہے۔ کوپن کی فوٹو کاپی قابل قبول نہیں۔

مُسلمان کے مُسلمان پر حقوق

نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا:

"ایک مُسلمان کے دوسرے مُسلمان پر چھ حقوق ہیں"۔ پوچھا گیا یارسول اللہ! وہ کیا ہیں؟۔ آپؐ نے فرمایا "جب تم مُسلمان بھائی سے ملو تو اُس کو سلام کرو، جب وہ دعوت دینے کے لئے مدعو کرے تو اُس کی دعوت قبول کرو، جب وہ تم سے نیک مشورے کا طالب ہو تو اُس کی خیر خواہی کرو اور نیک مشورہ دو، جب اُس کو چھینک آئے اور وہ الحمد للہ کہے تو اُس کے جواب میں یرحمک اللہ کہو، جب وہ بیمار پڑ جائے تو اُس کی عیادت کرو اور جب وہ مر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ۔"

(مُسلم)

عطیہ اشتہار

حاجی فتح محمد میموریل آرگنائزیشن

۷، حسن لشکری اسٹریٹ، بادشاہی روڈ کراچی

۸۷، بلاک نمبر ۷، خانیوال

خالد بن محمود احمد

دونوں سے نافرمانی ہو گئی۔

دونوں ہی اپنے مالک کی بات کو پورا نہ کر سکے۔ پھر ظاہر ہے کڑے لمحوں کا سامنا بھی دونوں کو ہی کرنا پڑا۔ لیکن ایک اس میں بہت پشیمان تھا' سخت شرمندہ۔ جب کہ دوسرے کو پرواہ ہی نہیں تھی۔ وہ غضب کا ہٹ دھرم تھا اور بے کار بحث کرنے والا۔ وقت نے بتایا کہ دونوں کی نافرمانی میں بھی فرق تھا۔

ایک نے تو ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔ اس سے جو کچھ ہوا بے ارادہ ہوا۔ چنانچہ اس کی نافرمانی "بھول" کہلائی۔ جب کہ دوسرے نے اپنی نافرمانی کو سرکشی تک پہنچا دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے مالک کا حکم بھی جان بوجھ کر توڑا ہے۔ واقعی بد قسمت تھا وہ۔

جس سے انجانے میں بھول ہو گئی تھی' اسے شرمندگی بھی بہت تھی۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ خود کو ندامت کے آنسوؤں میں بہا دے۔

"میں کیسے گڑگڑاؤں؟ میں کون سے الفاظ لاؤں؟" اس نے سوچا۔ "میں کیا تدبیر اختیار کروں کہ جس سے میرا مالک' میرا مہربان مالک' مجھ پر بے پناہ لطف و کرم کرنے والا مالک مجھ سے راضی ہو جائے۔"

وہ سوچتا رہا اور تڑپتا رہا۔ اس کی لگن سچی تھی۔ تڑپ اس کے دل سے نکل رہی تھی۔ رونے والی آنکھیں اسے میسّر تھیں۔ لہجے میں سوز اس کی شرمندگی نے پیدا کر دیا تھا۔ بس اسے الفاظ درکار تھے۔ ایسے الفاظ جو اس کے مالک کے شایانِ شان ہوں۔ جو اس کی شرمندگی ظاہر کر دیں اور جو اس کی معافی کی درخواست بھی بن جائیں۔

آخر اس کی تڑپ' اس کی لگن رنگ لائی۔ اس نے وہ الفاظ سیکھ ہی لئے۔ تب اس نے کہا :

"اے ہمارے رب' ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کر لیا۔ اگر آپ ہمیں معاف نہیں کریں گے اور ہم پر رحم نہیں کریں گے تو ہم سخت نقصان والے ہو جائیں گے۔" (ترجمہ)

مالک کو یہ ادا' یہ الفاظ پسند آئے۔ اس نے معاف کر دیا۔ نہ صرف معاف کر دیا بلکہ جو انعامات چھین لئے گئے تھے' اس نے پھر سے عطا کر دیئے۔ اور جس نے سرکشی کی تھی' وہ ہمیشہ کے لئے ذلیل ہوا' سزا کا مستحق ٹھہرا' اس پر لعنت ہوئی۔

جی ہاں آپ ٹھیک سمجھے! اللہ تعالیٰ کی رضا و مہربانی پھر سے پا لینے والے حضرت آدمؑ تھے اور سرکش و مجرم شیطان لعین۔ لیکن کیا آپ نے غور کیا۔ دل کی پشیمانی' آنکھ کے آنسو اور لہجے کے گداز میں جان ڈال دینے والے الفاظ کے پیچھے کیا تھا؟

جذبۂ بے تاب' سیکھنے کی لگن اور حصول علم کا ذوق و شوق۔

ALL THE GOODNESS OF MILK ON A STICK

mini milk kulfi

Here's a delicious treat your kids can wrap their hands around - Mini Milk Kulfi from Wall's. It's the nutritious snack designed to keep kiddie hands, mouths and tummies busy - till they ask for more!

Mini Milk Kulfi - the all tasty, all healthy treat for all the good kids in your family.

Wall's

...world's favourite ice cream!

RLINTAS

REGD. No. SS-246 OCTOBER 1996

MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI